تذکرہ شمع اردو

حصہ اول

یعنی

اردو کے مشہور شاعروں کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور کلام کی خصوصیات

از

ساحل بلگرامی

سنہ ۱۹۳۰ء

دار الاشاعت پنجاب لاہور

بار اول   تعداد ۱۰۰۰   قیمت

تذکرہ شمع اردو

حصہ اول

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ

مضمون	نمبر صفحہ
قصیدہ	۴۷
غزلیات	۵۱
مرثیہ	۵۴
بخیل گھوڑے کی ہجو	۵۸
متفرق اشعار	۶۲
میر درد	**۶۵**
آپ کی غزلیں	۶۸
متفرق اشعار	۷۱
انشا	**۷۳**
قصیدہ	۸۴
غزل	۸۶
متفرق اشعار	۸۹
میر حسن	**۹۱**
غزلیں	۹۵
مثنوی	۹۶
متفرق اشعار	۱۰۲

مضمون	نمبر صفحہ

تذکرہ شمع اردو

حصہ دوم

فہرست مضامین

مضمون	نمبر صفحہ

مضمون	نمبر صفحہ
امانت	۲۷۱
واسوخت	۲۷۵
غزلیں	۲۷۸
ٹھمری / ساون	۲۸۰
ہولی	۲۸۱
رند	۲۸۲
غزلیں	۲۸۴
متفرق اشعار	۲۸۵
جلال	۲۸۸
غزلیں	۲۹۱
متفرق اشعار	۲۹۲
امیر مینائی	۲۹۴
غزلیں	۲۹۷
متفرق اشعار	۳۰۱
حالی	۳۰۳

دیباچہ

انگلستان کی مشہور یونیورسٹی کیمبرج میں السنہ مشرقیہ کے پروفیسر براؤن آنجہانی تھے۔ ان کے ادبی شوق کو دیکھتے ہوئے ایک ہندوستانی طالب علم نے ان کو کہا۔ کہ وہ اردو سیکھیں۔ کہتے ہیں۔ کہ جب آپ نے پوچھا۔ کہ "کس لئے"؟ تو وہ طالب علم لاجواب ہو کر رہ گیا۔ اور نہ بتا سکا کہ اردو پڑھنے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ غالباً کئی اردو دان اس طالب علم کی طرح اپنے ادب کی صحیح قدر و قیمت سے ناواقف ہیں۔

ان ہی پروفیسر براؤن کو آخر عمر میں اردو نہ جاننے پر بے حد افسوس ہوا۔ کیونکہ انہیں فارسی ادب کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے "شعر العجم" کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ان کو اپنی کتاب میں اعتراف کرنا پڑا۔ کہ فارسی شاعری پر اس اردو کتاب سے بہتر کوئی تصنیف نہیں۔

نثر تو خیر ابھی کل کی پیدائش ہے۔ ادب سے صحیح ذوق رکھنے والوں کے لئے اردو شاعری ایک بے بہا خزانہ ہے۔ یوں اردو شاعری بھی دو صدیوں سے بہت زیادہ عمر کی نہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کے ہاتھ فارسی کی صدیوں کی پس انداز دولت آ گئی۔ اسی پیوند کی بدولت یہ شجر اس تھوڑے سے عرصے میں اتنا پھولا پھلا ہے۔ عروض۔ اصناف کلام تشبیہات و تلمیحات غرض سب کچھ فارسی ہے۔ لغت بھی چھپن فیصدی فارسی ہے۔ اردو کا پہلا شاعر امیر خسرو بھی فارسی کا شاعر ہے۔ لیکن خسرو کی اردو ایک کھیل سے زیادہ کچھ نہیں۔ نقش اول تو ضرور ہے۔ لیکن بہت دھندلا نقش ہے۔

مغلوں کے عہد میں ہندو مسلم ملاپ اور بڑھ گیا۔ ہندو

رانیاں شاہی حرم میں داخل ہوئیں۔ قلعہ کی زبان میں ہندی عنصر زیادہ ہوگیا۔ اور یوں اردو کا "جھروکہ درشن" عام ہونے لگا۔

جہانگیر کے عہد کے ایک شاعر ملا نوری نے پورا ایک مصرعہ اردو میں کہہ ڈالا ؎

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد
بیچارہ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

فارسی اردو ہندی کا یہ میل جول شمالی ہندوستان سے زیادہ جنوبی ہندوستان میں نمایاں رہا۔ دکن کی سلطنت ہندو مسلم اتحاد کا بہترین نمونہ تھی۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ نے عام کاغذات ہندی میں لکھوانے شروع کردئے۔ اور تو اور گولکنڈہ کے بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ایک مستقل مجموعہ کلام چھوڑا ہے۔ جسے یقینی طور پر اردو شاعری کا پہلا دیوان کہا جاسکتا ہے۔ یہ سلطان اکبر بادشاہ کا ہمعصر تھا۔ اس کے بعد گولکنڈہ کے تخت پر سلطان محمد قطب شاہ بیٹھا۔ جو اس کا ظاہری و معنوی جانشین تھا۔ کیونکہ اس نے بھی ایک اردو کا دیوان چھوڑا ہے۔ اس خاندان کا

آخری بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ بھی اردو کا شاعر تھا۔ بادشاہوں کے دیکھا دیکھی رعایا بھی اس طرف مشغول ہوگئی۔ چنانچہ تذکروں میں بیسیوں دکنی شعرا کا نام اور نمونۂ کلام درج ہے۔

اردو شاعری کا باوا آدم ولی بھی دکنی ہے۔ اس نے بھاشا اور سنسکرت کے دوہوں اور کبتوں کے اثرات کو الگ کر دیا۔ اور ایسی زبان استعمال کی۔ جو بعض دفعہ بالکل آج کل کے روزمرہ کے مطابق ہے۔ سنئے:-

ترا مجنوں ہوں صحرا کی قسم ہے۔
طلب میں ہوں تمنا کی قسم ہے۔

سراپا ناز ہے تو اے پریرو۔
مجھے تیرے سراپا کی قسم ہے۔

آج تیری نگہ نے مسجد میں۔
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا۔

ولی کے ہمعصر دکنی شعراء میں یہ بات نہیں پائی جاتی آخر عمر میں وہ خود دلی آگیا۔ اور اس طرح محمد شاہی دور میں اردو شاعری کا ایک باقاعدہ سکول قائم ہوگیا۔ شاہ مبارک آبرو۔ محمد شاکر ناجی۔ شیخ شرف الدین مضمون مصطفیٰ خاں

یکرنگ سب اسی دور کے لوگ ہیں - ان کی شاعری میں بھاشا کے دوہوں کا اثر موجود ہے - اور ایہام گوئی کمالِ سخن منصور ہوتی ہے + ناجی کا ایک مصرعہ ہے - ع اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں + اب رخسار کی رعایت سے دوسرا مصرعہ لکھا ہے - ع - عارضی میری زندگانی ہے +

ایک اَور شاعر لکھتا ہے ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخمِ عشق کو ٹانکے -

اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر ہیں آ دیا دے +

اس لفظوں کی قلابازی کا استاد شاہ مبارک آبرو ہے + مضمون - یکرنگ - احسن - سراج سب اسی طرز کے پیرو ہیں ﴿

ظاہر ہے کہ اہلِ ذوق اس کھوکھلی تک بندی سے اکتا گئے ہونگے + سب سے پہلے مرزا مظہر جانجاناں نے جو ایک اہلِ دل صوفی تھے - اس طلسم بندی کو توڑا - چنانچہ مصحفی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں - کہ حقیقی شاعری کی ابتدا مرزا جانجاناں سے ہوئی ﴿

اس وقت سے اب تک اردو ادب میں یہ دو

طرزِ خیال قائم ہیں - شاہ آبرو کا سکول - جس کے نزدیک ادب محض الفاظ کے الٹ پھیر کا نام ہے - اور مرزا مظہر کا سکول جو معنی کو ادب کی جان سمجھتا ہے - ناسخ و آتش - ذوق و غالب - یہ اسی اختلاف کے مظہر ہیں +

مرزا مظہر کے لگائے ہوئے بوٹے کو میر تقی - سودا - قائم وغیرہ نے دل کے خون سے سینچا - اور اردو شاعری کو اس قابل بنایا - کہ اس کا شمار دنیا کے ادب میں ہو سکے +

سودا کا دعوے ہے ؎

سخن کو ریختہ کا پوچھے تھا کوئی سودا؟
پسندِ خاطرِ دلہا ہوا یہ فن مجھ سے!

میر تقی کہتے ہیں ؎

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے -
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے +

اور قائم مُصر ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ -
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی +

تینوں اساتذہ نے حسب مراتب اس میں مدد دی - اور

تینوں نے یہ کام آبرو کی ایہام پرستی کو مٹانے سے کیا +
سودا کا قول ہے ع منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

میر کہتے ہیں - کہ ان کے کلام میں ع

کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

قائم کا اصول ہے کہ ع

تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام +

اس کا اثر یہ ہوا - کہ پرانے استادوں نے بھی اپنا انداز چھوڑ دیا - اور صحیح شاعری کی طرف توجہ کی - چنانچہ شاہ حاتم نے اپنے دیوان کا بیشتر حصہ کاٹ دیا - اور نئے رنگ کے اشعار کو "دیوان زادہ" نام رکھ کر شائع کیا + انہی بزرگ نے زبان کی اصلاح کی طرف توجہ کی - اور "متروکات" کی بنا ڈالی - چنانچہ دیباچے میں لکھتے ہیں - کہ انہوں نے ہندی بھاکا کے الفاظ چھوڑ کر عربی فارسی کے وہ الفاظ استعمال کیے - جو سب کی زبان پر ہیں - اور پرانے شاعروں کے خلاف تسبیح کو تسبی اور صحیح کو صحی نہیں لکھا - بلکہ صحیح طور پر باندھا ہے - نیز ڑ اور ر کو ہم قافیہ نہیں کیا - وغیرہ وغیرہ +

اب یہ باتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ آج تک جس قدر ترقی اردو شاعری کی زبان میں ہوئی ہے سب انہیں راہوں پر چل کر ہوئی ہے۔

مظہر اور حاتم خود بڑے شاعر نہ تھے۔ مگر یہ نہ ہوتے تو میر و سودا کو اس قدر جلدی اتنا کمال حاصل نہ ہوتا۔

ان مصلحین نے آنے والوں کے راستے سے حائل ہونے والے پتھر ہٹا کر شاعری کی ترقی کی رفتار تیز تر کر دی۔ چنانچہ ان کا نام تاریخ ادب میں سنگ میل کی طرح قائم رہیگا۔

سودا و میر کے وقت اردو شاعری پورے عروج پر تھی۔ ہر کس و ناکس شاعر ہونے کا دعوے دار تھا۔ مشاعروں پر مشاعرے ہوتے تھے۔ خود میر و سودا میں چشمک ہو جاتی تھی۔ میر صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا:۔

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں۔
یونہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے۔

یہ سودا کے اس شعر کے جواب میں ہے۔ جہاں وہ میر

کو استاد مانتے ہوئے کہتا ہے ؎

سودا تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ -
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف +

مگر دونوں ایک دوسرے کے کمال کے قائل تھے آخر عمر میں میر نااہلوں کی شورہ پشتی سے تنگ آ کر فرماتے ہیں ؎

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی -
گیا ہو میر دیوانہ رہا سودا سو مستانہ +

سودا قصیدہ میں زور سخن دکھاتا تھا - اور میر غزل میں جی جلاتا تھا + دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں - لیکن یہ ماننا پڑتا ہے - کہ اگر شاعری کا مقصد دل پر اثر کرنا ہے تو میر سے سودا کی کوئی نسبت نہیں + میر کا منتخب کلام دنیا کے کسی شاعر کے کلام سے کم نہیں ؛

سودا میں یہ بات نہیں - اس کی شاعری کی وقعت اردو ہی کے اور وہ بھی محدود حلقہ میں ہو سکتی ہے - یہ میر ہی کا اعجاز ہے - کہ ہر عہد میں ہر رنگ کے شاعران کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ؛

ناسخ سے

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں۔
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں +

ذوق سے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب۔
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا +

غالب سے

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب۔
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا +

حالی سے

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہوں۔
غالب کا معتقد ہوں مقلد ہوں میر کا +

شعر و شاعری کے یہ چرچے دہلی کی حکومت کے ساتھ رہے ۔ یہ حکومت گو نام ہی کی تھی ۔لیکن دہلی پھر بھی مرجع عوام و خواص تھی + میر تقی ہی کی زندگی میں (اور میر تقی سو سال زندہ رہے) اِس نام کی حکومت کو بھی زوال آ گیا ۔ اور بہت سے باکمال لکھنؤ کی طرف چل دیئے

جہاں کے نواب کوشش سے اپنے دربار کو علم و ادب کا
مرکز بنانے لگے۔ میر صاحب لکھنؤ تو آ پہنچے۔ لیکن ان سے
درباداری ہونی ناممکن تھی۔ چنانچہ وطن چھوڑ کر فرماتے
ہیں ؎

خرابہ دہلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا۔
وہیں میں کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں۔

لکھنؤ میں دنیا ہی اور تھی۔ درباری زندگی کے تصنعات
ہر شعبے میں نمایاں تھے۔ شاعری پر بھی اس کا اثر ہونا ضروری
تھا۔ جب اس زمانے کے مشاعروں کا حال سننے میں آتا
ہے۔ تو پہلوانوں کی کشتیوں اور اکھاڑوں کی یاد آتی
ہے۔ یہ سب اٹھارہویں صدی کے اواخر کی باتیں
ہیں۔ چنانچہ مصحفی جو اس عہد کے شاعر ہیں لکھتے ہیں ؎

کیا چمکے اب فقط مرے نالے کی شاعری۔
اس عہد میں ہے تیغ کی بھالے کی شاعری۔

شعرا نے ہجو سے گذر کر گالی گلوچ شروع کر دی۔ ریختہ
ریختی کی فحش گوئی میں ملبوس ہو گیا۔ متانت اور ثقاہت
کی جگہ ہزالی اور مسخرگی نے پائی۔ انشاء اور سعادت یار خاں

رنگین، کا کلام اس قابل نہیں۔ کہ مہذب لوگ اس کا مطالعہ کر سکیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ لکھنؤ کے تمام شعرا اسی قماش کے تھے۔ بے اعتدالی سبھی کے کلام میں ہے لیکن جتنے جتنے درباری تعلق سے دور رہے اتنا ہی کلام پاکیزہ رہا۔

خود انشا جب ترکِ خدمت کر کے گوشہ نشین ہو گئے کلام میں درد و سوز و گداز کا مزا آ گیا۔ ان کی یہ غزل غالباً اردو کی دس بہترین غزلوں میں شمار ہونے کے قابل ہے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں۔
نہ چھیڑ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی۔
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر۔
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں۔

آتش کی فضیلت کی بھی یہی وجہ ہے۔ اس کا دربار سے

کوئی تعلق نہ تھا + اس کے بہترین اشعار اردو کے بہترین اشعار ہیں ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا۔
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا +

؎ گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے۔
موت آتی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے +

؎ ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر۔
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے +

؎ آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے۔
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا +

؎ نہ پوچھ حال مرا چوبِ خشکِ صحرا ہوں۔
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا +

آتش کا ہمعصر ناسخ تھا۔ دونوں نے انیسویں صدی کے نصفِ اول کے آخری حصے میں وفات پائی ہے۔ لیکن کلام میں آسمان و زمین کا فرق ہے + ناسخ کے سارے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں۔ جو زندہ رہنے کے قابل ہو۔ لیکن ناسخ کا نام ایک اور وجہ سے شہرت ابدی کا مستحق

ہے۔ اور وہ اس کی اصلاحِ زبان ہے + یوں تو سب اساتذہ نے اردو کو سنوارا ہے لیکن ناسخ نے شاہ حاتم کی طرح یہ کام ضابطے اور اصول سے کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ میر اور ناسخ کی زبان میں جو فرق ہے۔ وہ فرق آج کی زبان اور ناسخ کی زبان میں نہیں۔ حالانکہ وقت کے اعتبار سے وہ فرق کم تھا اور یہ زیادہ! ناسخ کی متروکات آج تک ضرب المثل ہیں۔ لیکن بعد میں متروکات کا یہ شوق خبط کی حد تک جا پہنچا۔ اور کئی اچھی اچھی ترکیبیں اور خوشنما الفاظ خواہ مخواہ زبان سے خارج کئے جانے لگے +

اسی زمانے میں (انیسویں صدی کی ابتدا میں) لکھنؤ اور دہلی کے ادبی حلقوں سے دور ایک اور شاعر بستا تھا۔ جس کا نام لینا بھی بدذوقی کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج اسے اپنی قسم کا بہترین شاعر مانا جاتا ہے + اس شاعر کا سلسلہ نسب شاعری کے کسی سکول سے نہیں ملتا۔ یہ آپ ہی اپنی طرز کا موجد ہے۔ اور شاید آپ ہی مختتم!

ولی محمدؐ نظیر اکبر آبادی دہلی میں محمدؐ شاہ کے عہد پیدا ہوا۔ نادر شاہ کے حملے کے وقت + اس لحاظ سے وہ

میر و سودا کا ہمعصر ہے۔ وفات ۱۸۳۰ میں پائی۔ اس طرح ناسخ و آتش کا ہمعصر ہے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے سے پہلے آگرہ آیا۔ اور وہیں رہا۔ لہذا اس کا تعلق اردو کے کسی مرکز سے نہیں۔ اس کی تمام عمر کامل آزادی میں گزری۔ اس کی شاعری بھی تمام قدیم روایات سے کاملاً آزاد ہے۔ اس میں ایسی تازگی۔ ایسی جدت پائی جاتی ہے کہ اچھے اچھے نقاد اس کی تعریف میں مبالغہ کرتے ہوئے دوسری انتہا تک جا پہنچے ہیں۔ نظیر صحیح معنوں میں ہندوستانی شاعر تھا۔ اس کی زبان۔ اس کی تشبیہات۔ اس کے موضوعات۔ سب ہندوستانی ہیں۔ ناسخ۔ رشک۔ اسیر وزیر کے دیوانوں کے بعد نظیر کا کلام پڑھنا گویا ایک کال کوٹھڑی سے نکل کر صحرا میں آ پہنچنا ہے۔

وزیر و امانت کی بد اعتدالیوں سے لکھنؤ کی غزلیہ شاعری اپنی موت آپ ہی مرگئی۔ دہلی میں دوبارہ شعر و شاعری کا احیا ہوا۔ انیسویں صدی کے ارد گرد اردو شاعری پھر صحیح راستے پر چلنے لگی۔ مومن (۱۸۰۰ — ۵۱)۔ غالب (۱۷۹۶ — ۱۸۶۸) شیفتہ (۱۸۰۶ — ۱۸۷۲) نے اردو

شاعری کو پھر صحیح قالب میں ڈھالا - اور مبارک آبرو کی لفظی
سے ہٹ کر مرزا مظہر کی روش اختیار کی + ان ہی کے
عہد میں ذوق (۱۷۸۹ - ۱۸۵۴) بھی ہوا ہے۔ مگر اس کی
شاعری کو رونق اس کے اپنے عہد میں استادشاہ ہونے
اور بعد میں استادِ آزاد ہونے کی بدولت ہوئی - البتہ زبان
کو سلجھانے میں اس نے بہت کوشش کی ہے - لیکن
اس قدر نہیں کہ اسکا رتبہ ناسخ کے برابر قرار دیا جائے +
زبان کی صحیح خدمت مومن و غالب نے کی ہے -
فارسی کے پیوند سے انہوں نے اردو زبان کو اس قابل
بنایا - کہ اس میں باریک اور گہرے خیالات سما سکیں +
اگر غالب نہ ہوتا - تو اقبال کی حیات پرور شاعری یقیناً
اس قدر جلد اتنی بلندی پر نہ پہنچ سکتی !
مومن کی شاعری تمام تر عاشقانہ جذبات سے بھری
ہوئی ہے - غالب کا فکر اس سے زیادہ وسیع ہے - غالباً
غالب اردو کا پہلا شاعر ہے - جس کے کلام میں فلسفہ کا
رنگ پایا جاتا ہے +

اب تک اردو شاعری ایک خاص نہج پر قائم رہی -

لیکن فتح پنجاب اور غدر کے بعد ایک نئے دور کی ابتداء ہوتی ہے۔ لاہور میں ایک نئے کلیہ کی بنیاد پڑتی ہے۔ اور اردو ادب اور شاعری اول مرتبہ مغربی خیالات سے متاثر ہوتی ہے۔

لاریب رامپور اور پھر حیدر آباد میں داغ (۱۹۰۵-۱۸۳۱) اور امیر (۱۹۰۰-۱۸۲۸) کے معرکے ہوتے رہے۔ لیکن یہ گزری ہوئی بہار کے افسانہ خواں تھے۔ اب ہوا کا رخ کسی اور طرف تھا۔

مئی ۱۸۷۴ میں لاہور میں ہالرائڈ صاحب ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کے ایما پر مولانا محمد حسین آزاد نے ایک بزم مشاعرہ منعقد کی۔ جس میں پنجابی اور اردو زبان کے شعرا کو جمع کر کے انہیں مستقل مضامین پر مسلسل نظمیں لکھنے کے لئے کہا گیا۔ اور انگریزی شاعری کی مبادیات سے آگاہ کیا گیا۔ اس مشاعرہ میں کوئی مصرع طرح نہیں تھا۔ اور سننے میں آیا ہے۔ کہ کئی پنجابی اور اردو کے شعرا نے اسی وجہ سے اس مشاعرہ کو بائیکاٹ کر دیا۔ ہمارے شعراء رسمیات اور تصنعات میں اس قدر ڈوبے

ہوئے تھے۔ کہ وہ وارث شاہ کی "ہیر رانجھے" کی نظم۔ میر حسن کی مثنوی۔ انیس و دبیر کے مراثی کی روایات بھول چکے تھے۔ اور اس شاعری کو جو نئی تو ضرور تھی لیکن ایسی بھی اجنبی نہ تھی۔ شاعری سمجھنے سے انکار کرنے لگے ✤

اس نئی تحریک میں آزاد کا ساتھی حالی بھی تھا۔ دونوں پنجاب کے سررشتۂ تعلیم کے ملازم تھے۔ دونوں نے نئے انداز میں نظمیں لکھیں۔ آزاد کی مثنوی ابرکرم اور حالی کی برکھارت انہی مشاعروں کی یادگار ہیں ✤

یہ نئی تحریک پنجاب سے نکل کر تمام ہندوستان میں پھیل گئی۔ اور آج یو۔پی۔ حیدرآباد۔ بنگال ہر جگہ جدید شاعری کا دور دورہ ہے ✤

غالبًا یہ جدید تحریک محض مناظر قدرت کی فہرست نگاری کی حد سے نہ بڑھتی۔ اگر اقبال اس میں ایک نئی روح نہ بھر دیتا۔ اور یوں اردو شعرا کو دہ. اس نئی طرز میں تفکر اور گہرے خیالات کے ادا کرنے کی طرف متوجہ نہ کرتا۔

اقبال اردو کا پہلا شاعر ہے۔ جو صحیح معنوں میں زندگی کا نقاد ہے۔ جو اپنے اردگرد گہری نظر ڈالتا۔ اور ہر چیز کو

ہر تحریک کو اپنے معیار سے جانچتا ہے۔ جو نیک و بد میں تمیز کرتا ہے ؀

اُردو نثر ابھی خام ہے۔ اس میں کوئی میرؔ، غالبؔ یا اقبالؔ جیسا "عالمگیر" ادیب پیدا نہیں ہوا + اردو شاعری بھی ابھی ابتدائی مدارج طے کر رہی ہے لیکن اس ترقی کو دیکھتے ہوئے جو اس تھوڑے سے عرصے میں اس نے حاصل کی ہے۔ بڑے وثوق سے کہا جاتا ہے۔ کہ اسے دنیا کے بہترین ادب کا ہم پایہ ہونے کا فخر نصیب ہو کر رہیگا ؀

دیباچہ از مصنف

دن بدن اردو کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ ہو رہی ہے۔ اردو زبان سیکھنے کے ساتھ ان کے دل میں زبان کی تاریخ معلوم کرنیکا اشتیاق بھی پیدا ہو رہا ہے۔ تاریخ ادب پر اردو میں کئی بڑی بڑی اور قابلقدر کتابیں موجود ہیں لیکن وہ کتابیں ان ہی لوگوں کے لیے ہیں جنہیں ادب سے غیر معمولی دلچسپی ہو اور جو بہت تفصیل سے ادب کی تاریخ معلوم کرنا اور اس پر تنقید پڑھنا چاہتے ہوں۔ ایسی کوئی کتاب اردو میں موجود نہ تھی جس میں شعرا کے حالات انکے کلام کے نمونے اور انکے انداز بیان کی خصوصیات ایسے اختصار سے لکھی ہوں۔ کہ طلبا اور ادب سے معمولی دلچسپی رکھنے والوں کو ایک تو ان کی تفصیل اکتا نہ دے۔ بلکہ وہ شوق اور رغبت سے اس کا مطالعہ کریں اور دوسرے اس مطالعے سے زبان کی تاریخ اور اس کی تدریجی ترقی کا ایک خاکہ انکے ذہن میں قائم ہو جائے۔ اس کتاب میں یہی خصوصیت مدنظر رکھی گئی ہے۔ اور مجھے امید ہے میں نے یہ ناچیز کوشش جس غرض سے کی ہے۔ یہ کتاب اسے پورا کر سکے گی۔

(ساحل بلگرامی)

دار الاشاعت پنجاب لاہور



محمد تقی نام تھا اور میر تخلص۔ ان کے باپ کا نام عبداللہ تھا۔ یہ اکبر آباد (آگرہ) کے ایک مشہور خاندان میں سے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو ایک اچھے شاعر تھے۔ میر صاحب ان کے بھانجے تھے۔ اور انہیں کے زیر سایہ میر صاحب نے پرورش پائی۔

میر صاحب کی تعلیم کا پورا حال تو معلوم نہ ہو سکا۔ ہاں ان کی تصنیفوں سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے۔ کہ فارسی کی قابلیت اچھی تھی۔ میر صاحب کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ ہوتے ہوتے یہ بڑے بڑے مشاعروں

میں شریک ہونے لگے ؞

یہ بھی اچھی طرح نہیں معلوم ہوسکا۔ کہ دلی میں یہ اپنی گذر کس طرح کرتے تھے۔ لیکن اتنا یقین ہے کہ جب سلطنت کی تباہی کے ساتھ اچھے اچھے گھرانے مٹ گئے۔ تو میر صاحب بھی مصیبتوں میں مبتلا ہوگئے + پھر بھی یہ اوروں کی طرح گھبرائے نہیں۔ البتہ جب پانی سر سے گزر گیا۔ تو انہوں نے ۱۱۹۷ھ میں دلی چھوڑ کر لکھنؤ کا راستہ لیا + پوری گاڑی کا کرایہ پاس تھا نہیں۔ مجبوری سے ایک شخص کے ساتھ شریک ہوگئے ؞

تھوڑی دور چل کر اس شخص نے کوئی بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے + کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب جھلا کر بولے ”جناب آپ نے کرایہ دیا ہے۔ تو گاڑی میں بیٹھئے۔ باتوں سے کیا تعلق“۔ اس شخص نے کہا ”تو مضائقہ کیا ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں راستہ کٹ جائے گا“ میر صاحب بگڑ کر بولے ”خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے“ ؞

لکھنؤ پہنچ کر ایک سرائے میں ٹھہرے + معلوم ہوا کہ یہاں ایک مشاعرہ ہے ۔ رہ نہ سکے ۔ اُسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں پہنچے + ان کی پرانی وضع ۔ کھڑکی دار پگڑی ۔ پچاس گز گھیر کا پائجامہ ۔ ایک پورا تھان پستولئے کا کمر سے بندھا ۔ ایک رومال پٹڑی دار تہ کیا ہوا اس سے لٹکا ہوا ۔ مشروع کا پائجامہ ۔ جس کے عرض کے پائنچے ۔ ناک پھنی کی انی دار جوتی ۔ جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک ۔ کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار دوسری طرف کٹار ۔ ہاتھ میں جریب + غرض جب محفل میں داخل ہوئے ۔ تو پرانے بانکے لکھنوی انہیں دیکھ کر ہنسنے لگے + میر صاحب مسافر ۔ زمانہ نے پہلے ہی دل توڑ دیا تھا اور بھی کڑھے + ایک طرف بیٹھ گئے ۔ شمع ان کے سامنے آئی تو سب کی نظر پڑی ۔ اور بعض لوگوں نے پوچھا "جناب! آپ کا وطن کہاں ہے" + میر صاحب نے فوراً یہ قطعہ لکھ کر طرح کی غزل میں داخل کیا ؎

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

جب لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ میر صاحب ہیں تو سب نے معافی چاہی۔ اور صبح ہوتے ہوتے سارے شہر میں ان کی شہرت ہو گئی ‌۞

یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ یہ قصیدہ لکھ کر نواب کے دربار میں پہنچے ۔ نواب نے ان کی بہت قدردانی کی اور خلعت کے علاوہ سو روپلے ماہوار بھی مقرر کر دیئے جو ان کو آخر دم تک ملتے رہے ۞

کہتے ہیں کہ نواب آصف الدولہ سے کسی بات پر بگڑ گئی اور دربار جانا چھوڑ دیا ۔ جب نواب سعادت علی خاں کا زمانہ آیا۔ اس وقت تک یہ دربار سے الگ تھلگ رہتے تھے ۞

ایک دن نواب صاحب تحسین کی مسجد کی طرف سے سواری پر گزر رہے تھے۔ میر صاحب مسجد پر سر راہ بیٹھے

ہوتے تھے۔ انشا نواب کے ساتھ تھے۔ نواب نے پوچھا "یہ کون شخص ہے"۔ انشا نے بتلا دیا۔ نواب نے ان کو پھر دربار میں بلا کر خلعت عطا فرمائی اور ایک ہزار روپے بھی عنایت کئے۔ پھر یہ کبھی کبھی دربار میں جانے لگے۔

میر صاحب نہایت تیز مزاج۔ ہنس مکھ۔ منصف اور وضعدار آدمی تھے۔ ان کے متعلق یہ جو مشہور ہے۔ کہ ان میں غرور تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ ممکن ہے کہ بڑھاپے میں مزاج کچھ چڑچڑا ہو گیا ہو۔

ان کا قد نہ تو زیادہ بڑا تھا اور نہ زیادہ چھوٹا۔ گندمی رنگ تھا۔ ہر کام میں وقار اور آہستگی کا خیال رکھتے تھے بات بہت کم اور آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ آواز میں نرمی تھی۔ مزاج میں قناعت اور غیرت زیادہ تھی۔ ہر وقت کسی نہ کسی خیال میں ڈوبے رہتے تھے۔

سو برس کی عمر پائی۔ بڑھاپے میں یہ خوبیاں زیادہ ہو گئی تھیں۔ ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا۔ ان کی قبر بھیم کے تکئے واقع لکھنؤ میں ہے۔

میر صاحب کی تصنیفوں میں چھ دیوان اردو کے ہیں

اور ایک فارسی کا ایک تذکرہ اردو شاعروں کا ہے۔ اور ایک رسالہ ہے جس کا نام فیض میر ہے۔

اردو کے دیوانوں میں غزلیں۔ مثنویاں۔ واسوخت قصیدے۔ قطعے وغیرہ سب ہی کچھ ہیں + ان دیوانوں میں اچھے برُے سب قسم کے شعر ہیں۔ مگر جو ان میں انتخاب ہیں۔ وہ نہایت اچھے ہیں + لوگ کہتے چلے آئے ہیں کہ میر کے یہاں بہتّر نشتر ہیں لیکن یہ بہتّر کی تعداد فرضی ہے کیونکہ جو تڑپا دینے والا شعر پڑھا جاتا ہے۔ تو ہر سمجھ دار یہی کہہ دیتا ہے۔ کہ انہیں نشتروں میں سے ہے + انہوں نے زبان اور خیالات میں جتنی فصاحت اور صفائی پیدا کی۔ اس کا جواب نہیں + ان کا صاف اور سلجھا ہوُا کلام اپنی سادگی میں ایک خاص بات رکھتا ہے اور بہت لذّت دیتا ہے۔ اسی لئے ان کے کلام کو عوام اور خواص دونوں پسند کرتے ہیں + اصل میں انہوں نے یہ بات میر سوز سے لی لیکن ان کے یہاں صرف باتیں ہی باتیں تھیں۔ انہوں نے اس میں مضمون داخل کیا گھر یلو زبان کو بنا چُنا کر رنگ دیا اور اس قابل کر دیا کہ وہ

لوگوں کے کانوں کو بھلی معلوم ہو۔

میر صاحب نے قصیدے بہت کم کہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی طبیعت میں شگفتگی اور جوش و خروش نہ تھا۔ اس لئے جو کچھ انہوں نے اس قسم میں کہا ہے وہ ان کی شان کے مطابق نہیں ہے۔

میر صاحب نے واسوخت بھی کہے تھے۔ اور شک نہیں کہ وہ اپنا جواب اردو میں نہیں رکھتے۔ میر صاحب پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے اردو میں واسوخت کہا۔ ان کو اردو کے واسوخت کا موجد کہنا چاہئے۔

مثنویاں بہت سی بحروں میں کہی ہیں۔ جو مثنوی کے اصول ہیں۔ وہ میر صاحب کا قدرتی انداز ہے۔ ان میں شعلہ عشق اور دریائے عشق بہت خوب اور زیادہ مشہور ہیں۔ ان دو کے علاوہ جوش عشق۔ اعجاز عشق۔ خواب و خیال۔ معاملات عشق اور شکارنامہ بھی مثنویاں ہیں۔ جو دلچسپی سے خالی نہیں۔

ایک ساقی نامہ بہار کے حال میں لکھا ہے۔ اگرچہ اشعار کم ہیں لیکن لطافت اور فصاحت زیادہ ہے۔ اس

کے علاوہ اَور بھی کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں ۔

ایک مثنوی اپنے مرغے کے مرثیے میں لکھی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ میرا پیارا مرغا تھا۔ بڑا اصیل تھا۔ بہت خوبصورت تھا۔ اس پر بلّی نے حملہ کیا۔ مرغے نے بڑی بہادری سے اس کا مقابلہ کیا۔ لیکن آخر مارا گیا۔ مثنوی تو جیسی ہے سبحان اللہ۔ لیکن مرغے کے مرتے وقت کا ایک یہ شعر ایسا ہے جو بھلایا نہیں جا سکتا ؎

جھکا لبسوئے قدم سرخروس بے جاں کا۔
زمیں پہ تاج گرا ہدہد سلیماں کا۔

ایک مثنوی میں کہتے ہیں کہ میری ایک بلّی تھی۔ بڑی وفادار تھی۔ بڑی قناعت کرنے والی تھی۔ اس کے بچّے نہ جیتے تھے۔ ایک دفعہ پانچ بچے ہوئے۔ پانچوں جیتے تین بچّے لوگ لے گئے۔ دو رہے وہ دونوں مادہ تھے۔ ایک کا نام مونی رکھا اور دوسری کا نام مانی۔ مونی ایک میرے دوست کو پسند آ گئی۔ وہ لے گئے۔ مانی کے مزاج میں مسکینی بہت تھی۔ اس لئے وہ میرے ساتھ رہ پڑی اور کبھی مجھ سے الگ نہ ہوئی ۔

ایک کتا اور ایک بلّا پالا تھا۔ ان کے متعلق بھی ایک مثنوی لکھی تھی۔

ایک امیر کے ساتھ سفر میں میرٹھ تک گئے تھے۔ اس پر ایک مثنوی لکھی ہے۔ اس میں برسات کی تکلیف اور راستے کی مصیبت دل کھول کر بیان کی ہے۔

ایک مثنوی میں اپنی بکری کی حالت بیان کی ہے ایک بکری پالی۔ اس کے چار تھن تھے۔ بچّہ ہوا تو دودھ ایک ہی تھن میں اُترا۔ وہ بھی اتنا کہ بچّہ کا بھی پیٹ نہ بھرتا تھا۔ بازار کا دودھ پلا پلا کر اسے پالا۔ پھر بچّہ کی شوخیاں اور اس کا چلبلا پن بیان کیا ہے۔

ایک مثنوی آصف الدولہ کی شادی کے موقع پر اس کی آرائش میں کہی ہے۔

ایک چھوٹی سی مثنوی جھوٹ کی طرف سے خطاب کر کے لکھی ہے۔

دلّی میں میر صاحب نے ایک مثنوی کہی۔ اس میں اپنے آپ کو اژدھا قرار دیا۔ اور اپنے زمانہ کے شاعروں میں سے کسی کو سانپ کسی کو بچھو۔ کسی کو کنکھجورا وغیرہ

بھیڑ ابا + اسی کے ساتھ ایک حکایت لکھی کہ پہاڑ میں ایک بڑا ظالم اژدہا رہتا تھا + جنگل کے کیڑے مکوڑے جمع ہوکر اس سے لڑنے گئے + جب سامنا ہوا - تو اژدہے نے ایک ایسی آتشیں پھنکار ماری کہ سب مر گئے + اس مثنوی کا نام اژدھر نامہ ہے +

میر صاحب کی زبان دُھلی ہوئی پاک صاف تھی + بیان ایسا پاکیزہ تھا - جیسے باتیں کرتے ہیں - دل کے خیالوں کو محاورہ کا رنگ دے کر باتوں میں ادا کر جاتے تھے - یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں اصلیّت زیادہ ہے اور اصلیت کی وجہ سے اثر قیامت کا ہے + میر صاحب کو آرام چین تو کبھی نصیب نہیں ہوا - اس لئے وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے - اس کا دُکھڑا سناتے چلے گئے - جو آج تک سینوں میں درد پیدا کر دیتا ہے + ان کا کلام پکار پکار کر کہتا ہے - کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں - اس میں درد و غم بھرا ہوا ہے + میر صاحب کے دل پر جو گزرتی تھی - وہی زبان پر لے آتے تھے + ان کی وہ غزلیں جو چھوٹی چھوٹی بحروں میں ہیں -

نہایت خوب ہیں ۔ جو لفظ منہ سے نکلتا ہے وہ تاثیر میں ڈوبا ہُوا ہوتا ہے ۔

میر صاحب نے فارسی ترکیبوں یا اُن کے ترجموں کو اردو میں استعمال کیا ہے ۔ ان میں بعض تو لوگوں کو پسند آ گئیں اور استعمال میں آ گئیں اور بعض کو کسی نے نہ برتا اور وہ انہیں پر ختم ہو گئیں ۔

مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

مثنوی

صبح گاہاں وہ غیرت خورشید	اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہنچی نصف النہار دریا پر	روئی بے اختیار دریا پر
حد سے افزوں جو بیقرار ہوئی	دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دریا	یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش	تھا تلاطم سے کس طرح ہمدوش
تجھ کو آیا نظر کہاں آ کر	پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر
مجھ کو دیجو نشاں اس جا کا	میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں ناآشنائے سیراب	ناشناسائے موجۂ گرداب

بچہ کیا ۔ لطمہ کس کو کہتے ہیں — گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں
ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور — اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل — لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے سگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کے مانند — پھر نہ تھا کچھ سراب کے مانند
سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر — گر پڑی قصد ترک جاں کر کر
موج ہر یک کمند شوق تھی آہ — لپٹی اس کو برنگ مار سیاہ
دام گستردہ عشق تھا نہ آب — جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حسن موجوں میں یوں نظر آوے — نور مہتاب جیسے لہراوے
تھی وہ اس کی حنائی انگشت — غیرت افزائے پنجۂ مرجاں
سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا — سطح پانی کا آئینہ سا رہا
کشش عشق آخر اس مہ کو — لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
باہم آغوش مردہ یار ہوئے — تہ میں دریا کے ہمکنار ہوئے
پاک کی زندگی ز آلائش — ہو گئے دست و بغل کی آسائش
سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ — آفت اک لے گئی نئی دایہ
اب و عم مادر و برادر سب — خاک افشاں و آہ و نالہ بلب
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں — آتش غم سے دل جگر بریاں

خلق یک جا ہوئی کنارے پر | حشر برپا ہوا کنارے پر
وا مداروں سے سب نے کام لیا | آخر ان کو اسیر دام کیا
نکلے باہر وے موئے نکلے | دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ربط چسپاں بہم ہویدا تھا | مرگئے پر بھی شوق پیدا تھا
جو نظر ان کو آن کرتے تھے | ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے تھے وصلی وار | ہم دگر سے جدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہوئے ان کا فصل | جان دیدے ہوا ہو جنکا وصل

حیرت کار عشق سے مردم
شکل تصویر آپ میں تھے گم

اب غزلیں پڑھو۔ جن کے میر صاحب بادشاہ ہیں:۔

غزلیں

تھا مستعار حسن سے اُس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا
پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم

یک شعلہ برق خرمن صد کوہ طور تھا
مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم
سو اس عہد کو اب وفا کر چلے

شفا اپنی تقدیر ہی میں نہیں
کہ مقدور تک تو دوا کر چلے

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لئے
ہر اک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

کوئی نا امید انہ کرتے نگاہ
سو تم ہم سے منہ ہی چھپا کر چلے

نہ دیکھا غم دوستاں شکر ہے
ہمیں داغ اپنا دکھا کر چلے

کہیں کیا پوچھے جو کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے
گاہے بکا کرے ہے گاہے دعا کرے ہے
ہم طور عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینہ میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

کیا کہئے داغ دل ہے ٹکڑے جگر ہے سارا
جانے وہی جو کوئی ظالم وفا کرے ہے
سمجھا ہے یہ کہ مجھ کو خواہش ہے زندگی کی
کس ناز سے معالج میری دوا کرے ہے
کیا جانے کیا تمنّا رکھتے ہیں یار سے ہم
اندوہ ایک جی کو اکثر رہا کرے ہے
اک آفت زماں ہے یہ میر عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

راضی ہوں گو کہ بعد از صد سال و ماہ دیکھوں
اکثر نہیں تو تجھ کو میں گاہ گاہ دیکھوں
جی انتظار کش ہے آنکھیں ہیں رہگزر پر
آجا نظر کہ کب تک میں تیری راہ دیکھوں
یہ دل وہ جا ہے جس میں دیکھا ہے تجھ کو میں نے
کن آنکھوں سے اب اجڑا اس گھر کو آہ دیکھوں
چشم و دل و جگر یہ سارے ہوئے پریشاں
کس کس کی تیرے غم میں حالت تباہ دیکھوں

آنکھیں تو تو نے دی ہیں اے جرم بخش عالم
کیا تیری رحمت آگے اپنے گناہ دیکھوں

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا
قافلے میں صبح کے اک شور ہے
یعنی غافل۔ ہم چلے سوتا ہے کیا
سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا
یہ نشان عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا
غیرت یوسف ہے یہ وقت عزیز
میرؔ اس کو رائگاں کھوتا ہے کیا

جو اس شور سے میرؔ روتا رہے گا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں

جیسے ابر ہر سال روتا رہے گا

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

بس اے گریہ آنکھیں ترے کیا نہیں ہیں
کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا

مرے دل نے وہ نالہ پیدا کیا ہے
جرس کے بھی جو جوش کھوتا رہے گا

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

چشم دل کھول اُس ہی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

آتش غم میں دل بھُنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

دیکھیے ابر کی طرح اب کی
میری چشم پُرآب کی سی ہے

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں

ساری مستی شراب کی سی ہے

اب کچھ متفرق اشعار درج کر کے میر صاحب کے بیان کو ختم کیا جاتا ہے۔

متفرق اشعار

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے
ہے خیر میر صاحب کیا تم نے خواب دیکھا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوڑی چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

داغ فراق و حسرت وصل آرزوئے شوق
میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

جہاں سے فتنہ کو خالی کبھی نہیں پایا
ہمارے وقت میں تو آفت زمانہ ہوا

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا
جو کچھ کہ یاں ہے سو افسوس ہے جوانی کا

نظر میرؔ نے کیسی حسرت سے کی
بہت رو لیے ہم اس کی رخصت کے بعد

مرگ اک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں
چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں

کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب

سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو
یوں رفتہ اور بیخود کب تک رہا کروگے
تم اب بھی میر صاحب اپنے تئیں سنبھالو

آگے نکھے ابتدائے عشق میں ہم
اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ

ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے
ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

بہت سعی کیجے تو مر رہئے میر
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

پتھر کی چھاتی چاہئے ہے میر عشق میں
جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

جب نام ترا لیجئے تو چشم بھر آدے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آدے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے
لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

سودا

مرزا محمد رفیع نام تھا اور سودا تخلص۔ باپ کا نام مرزا محمد شفیع تھا۔ ان کے بزرگ کابل میں رہتے تھے۔ سپہ گری کیا کرتے تھے۔ ان کے باپ تجارت کرتے ہوئے ہندوستان آئے اور یہیں رہ پڑے۔ سودا یہیں ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ دلی میں پرورش پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ ایک بڑے پھاٹک میں بیٹھا کرتے تھے۔

اول سلیمان قلی خاں وداد کے شاگرد ہوئے۔ پھر حاتم کو اپنا استاد بنایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے شعر کہنے میں بڑی مشق پیدا کر لی۔ گھر گھر ان کی غزلیں

پھیل گئیں اور شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام انہیں دکھانے لگے + بادشاہ فرمائشیں بھی کیا کرتے تھے - ایک روز کسی غزل کا تقاضا کیا - انہوں نے عذر کیا + شاہ عالم نے فرمایا "مرزا تم روز کتنی غزلیں کہہ لیتے ہو" مرزا نے کہا "حضور! جب طبیعت لگ جاتی ہے تو دو چار شعر کہہ لیتا ہوں" حضور نے فرمایا "بھئی! ہم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں" ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور! ویسی ہی بو بھی آتی ہے" یہ کہہ کر چلے آئے + بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلایا - لیکن پھر یہ نہ گئے +

نواب شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو بہت اشتیاق سے خط لکھ کر انہیں بلایا - سفر کا خرچ بھی بھیجا - انہیں دلی چھوڑنا گوارا نہ تھا - جواب میں یہ رباعی لکھ کر بھیج دی ؎

سودا پئے دنیا تو بہر سو کب تک -
آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک +
حاصل یہی اس سے نا کہ دنیا ہووے -
بالفرض ہوا یوں بھی - تو پھر تو کب تک +

کئی برس بعد جب ان کے قدردان نہ رہے - دلی اجڑ

گئی۔ تو یہ بھوکوں مرنے لگے۔ مجبور ہو کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اس زمانہ میں نواب احمد خاں غالب جنگ فرخ آباد کے حاکم تھے۔ یہ خود شاعر تھے۔ اس لئے شاعروں کی قدر کرتے تھے۔ اس وقت جو دلی سے نکلتا تھا۔ وہ اِدھر ہی کی راہ لیتا تھا۔ سودا بھی وطن چھوڑ کر فرخ آباد آئے۔ اور یہاں چند سال اطمینان کے ساتھ گذارے۔

۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور یہ فیض آباد چلے آئے۔ اس وقت شجاع الدولہ حاکم تھے۔ انہوں نے ان کی بہت عزت کی۔ اور کچھ تنخواہ مقرر کر دی۔ شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ دارالسلطنت ہو گیا۔ اور آصف الدولہ لکھنؤ میں رہنے لگے۔ سودا بھی یہیں چلے آئے۔ اور اخیر وقت تک نواب آصف الدولہ اور لکھنؤ والوں کی قدردانی سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

مرزا قریب قریب ستر برس زندہ رہے۔ ۱۱۹۵ھ میں اس دنیا کو چھوڑا اور آقا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے۔

ان کی کلیات ہر جگہ دستیاب ہو سکتی ہیں + اس میں
اول اول اردو کے قصیدے ہیں - اسی طرح چند فارسی کے
قصیدے ہیں + ۲۴ مثنویاں ہیں - بہت سی چھوٹی بڑی حکایتیں
نظم کر دی گئی ہیں + ایک پورا فارسی کا دیوان ہے - ایک
اردو غزلوں کا بھی دیوان ہے - جس میں غزلیں - مرثیے -
رباعیاں - مستزاد - قطعے - تاریخیں - واسوخت - پہیلیاں
ترجیع بند مخمس سب کچھ ہیں - بہت سی ہجویں بھی ہیں +

انہوں نے سب سے پہلے قصیدے کہے اور اس
دھوم دھام سے کہے کہ اردو میں اس شان کے قصیدے
کوئی نہ کہہ سکا + ان کے اردو کے قصیدے فارسی شاعروں
کے قصیدوں سے ٹکر کھاتے ہیں + ان کے کلام کا زور فارسی
کے بڑے بڑے شاعروں مثلاً خاقانی اور انوری کو دباتا ہے
اور نزاکت و لطافت میں عرفی اور ظہوری کو شرماتا ہے +

مثنویاں بہت خوب ہیں - لیکن عاشقانہ مثنویاں ان
کے رتبہ سے گری ہوئی ہیں +

غزلیں بہت دل پسند ہیں - ایسی ایسی زمینوں میں
غزلیں کہی ہیں - جو اس وقت تک اردو میں نہ آئی تھیں +

زمینیں مشکل ہونے کے ساتھ ہی ردیف اور قافیے بھی دشوار ہیں۔ پھر بھی انہوں نے جس طرح الفاظ کو بٹھا دیا ہے۔ اگر کوئی دوسرے طریقہ سے ان کو بٹھانا چاہے تو کسی طرح نہیں بیٹھ سکتے۔

ان کے کلام میں شوخی بھی بہت ہے۔ ہجویں جو کلیات میں ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ پھول جاتا ہے۔

مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں۔ اس زمانہ میں چار مصرعے والے بند ہوتے تھے۔ انہوں نے مخمس اور مسدس کے مرثیے کہے ہیں۔

مختصر یہ کہ سودا مانے ہوئے استاد تھے۔ ہر رنگ میں کہتے تھے۔ شاعری پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ کلام کا زور مضمون کی باریکی اور تازگی دل خوش کر دیتی ہے۔ بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو نہایت عمدہ طریقہ سے جڑ دیتے ہیں۔ تشبیہہ استعارے ان کے یہاں موجود تو ہیں لیکن بہت کم۔ جن لوگوں نے اردو کو پاک صاف کیا۔ مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ انہوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپایا ہے۔ مرزا اکثر ہندی

کے مضمون نہایت عمدہ طریقہ سے لاتے ہیں۔ لفظ اس طرح
سے تراشتے ہیں کہ سب اس کو پسند کرتے ہیں ٭

ان کی طبیعت میں شوخی زیادہ تھی۔ حاضر جواب بھی
بہت تھے۔ ہجو کہنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ ان کے
چند لطیفے مشہور ہیں۔ جو ان کی عادتوں پر دلیل ہیں ٭

آصف الدولہ ایک دفعہ شکار کو گئے۔ خبر آئی کہ نواب
نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا۔ سودا نے فوراً کہا سے

یارو یہ ابن ملجم پیدا ہوا دوبارا۔
شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب کو خبر ہوئی۔ جب پھر کر آئے تو دوستانہ شکایت
کی کہ مرزا تم نے ہمیں شیر خدا کا قاتل بنایا۔ ہنس کر کہا۔
"جناب عالی! شیر تو اللہ ہی کا ہوتا ہے۔ نہ حضور کا اور نہ میرا" ٭

آصف الدولہ کی اتائی لڑکی چھوٹی عمر کی تھی لیکن
بڑی شوخ تھی۔ اول تو نواب خود ہی بے پروا آدمی تھے
دوسرے لڑکی کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ایک روز دوپہر
کو نواب سو رہے تھے۔ اس نے ایسا غل مچایا۔ کہ یہ سوتے
سے چونک اٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے

باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ بادشاہ کو غصہ آ گیا۔ خدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بلاؤ۔ مرزا اسی وقت حاضر ہوئے۔ فرمایا "بھئی مرزا! لڑکی نے ناک میں دم کر دیا ہے اس کی ہجو کہہ دو۔ فوراً قلم دوات لے کر پوری مثنوی کہہ ڈالی۔ اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

لڑکی وہ جو لڑکیوں میں کھیلے ۔۔۔ نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڈ پیلے

ایک دن میاں ہدایت ملاقات کو آئے۔ یہ صاحب بڑے بھاری بھرکم اور پرانے آدمی تھے۔ سودا نے پوچھا "میاں صاحب! آج کل کیا شغل ہے" انہوں نے کہا۔ "دنیا کی فکریں نہیں چھوڑتیں۔ کبھی کبھی غزل کہہ لیتا ہوں" مرزا نے کہا "ہجو کہا کرو۔ غزل میں کیا رکھا ہے" ان بیچارے نے حیران ہو کر کہا "ہجو کس کی کہوں"۔ آپ نے فرمایا۔ "ہجو کو کیا چاہئے۔ تم میری ہجو کہو۔ میں تمہاری کہوں"۔

قصیدہ کا نمونہ:-

قصیدہ

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل

تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمردار ہر ایک
دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عزّ و جل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات ملک پھول سے لے کر تا پھل
واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ
اب جو قطع لگے کرنے روش پر مخمل
بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھینٹ قلمکار بہ وحشت و جبل
عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول
تار بارش میں پروتے ہیں گہرہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بار سے آب رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ ازبس کہ ہوا ہے بیکل
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم ہے پہنچی
شمع ساں گرمی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاوزمیں کے بھی جو پھوٹے کونپل
دم عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل
فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنی
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل
حد ایام کے پیش از مدد نامیہ سے
بچہ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل
دست گل خوردہ دشاخ گل و گلزار بہم
بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل
غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فضل ہے یہ
گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل
آوے ہے ان کے نظر لاکھ طرح کا وہ پھول
ان گلوں چھٹ جو نگہ لے ہیں سدا مستعمل
یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے سماجیت کرے سبزے سے بدل
چشم نرگس کی بصارت کے زبس ہے درپئے

غنچۂ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکحل
اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشم سیار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل
آب جو گرد چمن لمعہ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغر لعل میں جوں کیجے زمرد کو حل
زنگ نے زینۂ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی بس کہ ہوا سے صیقل
برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے
گل کو دیکھو تو نگہ جائے ہے سنبل پہ پھسل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہی کثرت لغزش بہ زمیں ہر باغ
جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل
فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل

دانہ جس شور زمیں میں نہ پھلا دہقاں سے
سبز واں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل
کشت کرنے میں ہر اک تخم سے از فیض ہوا
گرتے گرتے بزمیں برگ و بر آتا ہے نکل
جوہری کو چمنستاں جہاں میں اس فضل
آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل
تا کجا شرح کروں میں کہ بقول عرفی
اخگر از فیض ہوا سبز شور در منقل

غزلوں کا نمونہ:۔

غزلیں

مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر حرف زباں کا
پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو عالم ہے خزاں کا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
لیکن نہیں خواہاں کوئی واں جنس گراں کا

سودا جو کبھی گوش سے ہمت کے سنے تو
مضمون یہی ہے جرس دل کی فغاں کا

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے
تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں ہے کہ نہیں

جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ سے زباں ہے کہ نہیں

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کونسا انداز فغاں ہے کہ نہیں

پوچھا سودا سے میں اک روز کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں

یک بہ یک ہو کے برآشفتہ لگا کہنے

کچھ نہ تجھے عقل سے بہرہ بھی یہاں ہے کہ نہیں

دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر ایک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا
ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤنگا

لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا

چین دینے کا نہیں زیر زمیں بھی نالہ
سوتوں کی نیند میں کرنے میں خلل جاؤنگا

چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نکہت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

جو گزری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا
بلاکشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

کہے ہے سن کے مری سرگزشت وہ بے رحم
یہ کون فکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا

یہ کون حال ہے احوال دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا

دیا اسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھیو جو ہوا سو ہوا

اس کے بعد ہم ان کے مرثیئے کا نمونہ بھی یہاں درج کرتے ہیں:-

مرثیہ

کس سے اے چرخ کہوں جا کے تری بیدادی
ہاتھ سے کون نہیں آج ترے فریادی
جو ہے دنیا میں سو کہتا ہے مجھے ایذا دی
یاں تلک پہنچی ہے ملعون تری جلادی
کوئی فرزند علی پر یہ ستم کرتا ہے
کیوں مکافات سے اس کے تو نہیں ڈرتا ہے

وہ علی ابن ابی طالب و داماد رسولؐ
وہ علی جس سے بیاہی تھی محمدؐ نے بتول
وہ علی جس کا سخن ہووے گا محشر میں قبول
اُس کے فرزند تری تیغ سے ہو ویں مقتول
آدمی ہی نہیں تنہا ترے ہاتھوں غمناک
جن اور حور و ملک ڈالتے ہیں سر پر خاک
یہ وہ فرزند علی تھا کہ جسے صبح و شام

آکے روح الامیں کرتا تھا دینے میں سلام
اور کہتے تھے سبھی خورد وکلاں مل کے تمام
جن و انسان و ملک حور کا بیشک ہے امام
اس کو کربل میں کیا ذبح پیاسا ہیہات
کیا دکھا دے گا محمد کو تو اب رو بذات

خویش و فرزند و عزیز اس کے تھے جتنے پیارے
تشنہ و تیغ سے تیں ظالموں کے سب مارے
اہلبیت اس کے جو باقی ہیں سو ہیں آوارے
قید میں کوفیوں کے جاتے ہیں وہ بیچارے
نہ انہیں چین ہے دن کو نہ انہیں رات آرام
اس مصیبت سے چلے جاتے ہیں کربل سے شام

لٹے جاتے ہیں وہ جس راہ سے ہے خارستان
نہیں تالاب و کنوئیں کا کسی منزل میں نشان
پا برہنہ چلے واں زین عبا تشنہ دہاں
سر کھلے اور وہ اشخاص بہ پشت شتراں
جن کے محمل کی طرف دیکھ نہ سکتا تھا ملک
مہر و مہ کی نہ پڑی جن پہ نظر آج تلک

لئے جاتی ہے جو اس کو سپہ شام کی صف
کوئی ان میں نہیں ایسا جو کرے ان کی طرف
پیٹ کر منہ کو یہ کہتا ہے کہ یا شاہ نجف
سر بنایا ہے مرے باپ کا نیزے پہ ہدف
گھوڑے دوڑا کے اُسے مارتے جاتے ہیں نیر
جو کماندار تھے اُس فوج ستم میں بے پیر
غرض اس طرح کی ایذاؤں سے عابد کے تئیں
لے گئے شام تلک ساتھ حرم کے وہ لعیں
داخل کفر ہوئے چھوڑ محمدؐ کا دیں
آخر کار لعینوں نے بطشت زریں
لے گئے رکھ کے بشاشت سے سر شاہ شہید
جس جگہ بیٹھا تھا دیوان کئے ملعون یزید
رجز پڑھتے ہوئے آئے وہ لعیں لے کر سر
اسپ مانگے تھا کوئی اُن میں کوئی خلعت وزر
شمر ملعون عمر سعد پھر آگے آ کر
عرض کرنے لگے یوں سامنے اس طشت کو دھر
لائے ہیں آج سر اس کا ترے فرمائے سے

جس کا رتبہ ہے بڑا عرش کے بھی پائے سے
یہ وہ سر ہے جو رہا دوش محمدؐ پہ مدام
لائے کربل سے جسے رکھ کے سناں پر تا شام
اہلبیت اس کے یہ زنجیر میں حاضر ہیں تمام
دے شتابی ہمیں جو مجھ کو ہے دینا انعام
کام ہم نے یہ خلافت کے لئے تیرا کیا
کہ سبب جس کے سے دین اپنے کو برباد کیا
مستقل تا کہ ہو تم دین سے ہم منہ موڑا
ایک کو آل محمدؐ سے نہ جیتا چھوڑا
مزد تو دے ہمیں کس چیز کا ہے یاں توڑا
کسی کو بخش تو گھوڑا دے کسی کو جوڑا
اتنے ہی واسطے کرتا ہے سپاہی محنت
تا کہ محنت کے عوض دے اسے آقا راحت

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ یہ ہجو بہت جلد لکھ ڈالتے تھے
اب ہم یہاں ایک بخیل کے گھوڑے کی ہجو لکھتے ہیں:-

بخیل کے گھوڑے کی ہجو

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانہ کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہربان
پادے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھے ہیں ایک پر اتنا ذلیل و خوار

نہ دانہ و نہ کاہ و نہ تیمار نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال

کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے نعل کی ہوویں نہ استوار
نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلادے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنّت سے ہو سوار
مٹھا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار
دلّی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار
مدّت سے کوڑیوں کو اڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میدان میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا اس پہ زین
ہنتھیار باندھ کر میں ہوا اس اوپر سوار

جس شکل میں سوار تھا اس دن میں اس اوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
ٹخ ٹخ کی پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے تو بڑہ اسے دکھلائے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لایا تھا رد براہ
ہلتا نہ تھا جگہ سے جوں میخ استوار

اس مضحکہ کو دیکھ ہو لئے جمع خاص و عام
اکثر مدبران میں کہتے تھے یوں پکار

پہئے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پوں کے دو اختیار

کہتا تھا کوئی ہے بزکوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار

پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ

کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں نہ مجھے سوار

کہنے لگا یہ آ کے اس اجماع میں ایک شخص

گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہگار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں

ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز

فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے واں دُچار

دھوبی کمہار کی گدھی اس دن ہوئی تھی گم

اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے واں گزار

ہر اک نے اس کو اپنی گدھی کا خیال کر

پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

کُتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اس کے گرد و پیش

ساتھ اس سمند خرس نما کے ہو چشم چار

جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب

کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب

واں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گزار

یہ کہہ کے حق ستی ہیں ہوا مستعد بجنگ
اتنے میں مرہٹہ لے ہوا مجھ سے بھی دوچار
گھوڑا تھا بس کہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کے حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل شیرخوار
جب میں نے دیکھا جنگ کی یا تو بندھی یہ شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں یار

متفرق اشعار

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

بھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

غنچہ سمٹے تو سمٹے ممکن ہے
دل جو بکھرے تو کب سنبھلتا ہے

پوچھے ہے پھول پھل کی خبر اب تو عندلیب
لوٹے۔ جھڑے خزاں ہوئی پھولے پھلے گئے

جس سے پوچھا کہ یہ دل خوش ہے کہیں دنیا میں

رودیا اُن نے اور اتنا کہا کیا کہتے ہیں؟

شب تری بزم میں سودا کو میں دیکھا جب تک
کچھ خوشی کے سوا اُس کو سروکار نہ تھا
عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں
نگہ ہو" باد جس کے دل کا نہ پوچھ اس سے تو دُکھ ہمارا
یہ درد سن اس رئیس سے ٹک جو لٹتے دیکھے دیار اپنا

بیکس کوئی مرے تو چلے اس پہ دل مرا
گویا ہے یہ چراغ غریبوں کی گور کا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا
اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا
فرصت ہو باغباں کو ذرا دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نجائیگا
سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانہ میں

سودا جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا
جاتا ہوں ایک میں دل پر آرزو لئے

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف اور ثمر بھی
اے خانہ براندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ
کافی ہے تسلی کے لئے ایک نظر بھی

سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

میر درد

سید خواجہ میر نام تھا۔ اور درد تخلص کرتے تھے۔ باپ
کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیب تھا۔ ان کا نسب گیارہ واسطوں
سے خواجہ بہاء الدین نقشبند سے اور پچیس واسطوں سے
امام حسن عسکری علیہ السلام سے مل جاتا ہے۔ دلی میں پیدا
ہوئے۔ اور باپ کی گود میں پلے بڑھے۔ شاہ گلشن کے
مرید اور خلیفہ تھے۔ بائیس برس کے سن میں دنیا سے منہ موڑ
کر والد کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ دلی کے بگڑنے پر تمام شریف
امیر پورب کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ لیکن انہوں
نے اخیر دم تک دلی نہ چھوڑی۔ تھوڑی سی جاگیر تھی۔ اور

کچھ مریدوں وغیرہ کی طرف سے نذر و نیاز میں آجاتا تھا۔اسی میں یہ اپنا پیٹ پالتے تھے +

اس زمانہ میں جو علم شریفوں میں پڑھائے جاتے تھے اس میں یہ بڑے قابل تھے + تصوف اور موسیقی میں بہت مہارت تھی + دلی کے بڑے بڑے گویے ان کی موسیقی کا لوہا مانتے تھے اور اپنی چیزیں اصلاح کے لئے پیش کرتے تھے + ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں گانے بجانے کی محفل ہوا کرتی تھی ۔اس میں بڑے بڑے عالم اور امیر شریک ہونا اپنا فخر سمجھتے تھے + شاہ عالم بادشاہ بھی کئی بار ان مجلسوں میں شریک ہوئے ہیں +

اسرار الصلوٰۃ ایک رسالہ ہے ۔جو انہوں نے پندرہ برس کے سن میں لکھا ہے + واردات دل ایک دوسری کتاب ہے ۔جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں ۔اس کی شرح بھی کی ہے ۔اس کا نام علم الکتاب ہے + اس کتاب سے ان کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے + ایک اور رسالہ بھی ہے جس میں گانا سننے کی نسبت بحث ہے + ایک دیوان فارسی میں ہے اور دوسرا اردو میں + قصیدہ بالکل نہیں کہا چھوٹی

بحروں میں غزلیں خوب کہتے تھے۔ میر کے رنگ سے رنگ ملا دیتے تھے۔ بلکہ اخلاق اور تصوف کی چاشنی سے ان کا کلام اور بھی زیادہ مزیدار ہو جاتا تھا۔ میر تقی میر نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے۔

لکھنؤ میں کسی نے میر تقی میر سے پوچھا۔ کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہیں۔ کہا "ایک تو سودا۔ دوسرا یہ خاکسار" اور کچھ تامل کر کے کہا "آدھے خواجہ میر درد" کوئی شخص بولا" اور میر سوز صاحب" تو یہ ذرا تیوریوں پر بل ڈال کر بولے "میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں!" انہوں نے کہا "آخر آصف الدولہ کے استاد ہیں" کہا "خیر۔ یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شریفوں میں ایسے تخلص نہیں رکھے جاتے"۔

خواجہ صاحب نے ۶۱ سال کی عمر پائی۔ ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ جمعہ کے روز انتقال فرمایا۔ دلی میں ترکمان دروازہ سے باہر ان کا مدفن ہے۔

آپ کی غزلیں

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہو گئے بدن خالی　　جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
نالہ فریاد آہ اور زاری　　آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی　　ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی
دردؔ کو قصّہ مختصر دیکھا

اگر یوں ہی یہ دل ستاتا رہے گا　　تو اک دن مرا جی ہی جاتا رہیگا
میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے　　مری یاد تجھ کو دلاتا رہیگا
گلی سے تری دل کو لے تو چلا ہوں　　میں پہنچوں گا جب تک یہ آتا رہیگا
جفا سے غرض امتحان وفا ہے　　تو کہہ کب تلک آزماتا رہے گا
قفس میں کوئی تم سے اے ہم صفیرو　　خبر گل کی ہم کو سناتا رہے گا

خفا ہو کے اے دردؔ مر تو چلا تو
کہاں تک غم اپنا چھپاتا رہے گا

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں

مٹ جائیں ایک آن میں کثرت نمایاں
ہم آئینہ کے سامنے جب آکے ہو کریں

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جا ابھی
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

سر تا قدم زباں ہیں جو شمع گو کہ ہم
پر یہ کہاں مجال جو کچھ گفتگو کریں

نہ گل کو ہے ثبات نہ ہم کو ہے اعتبار
کس بات پر چمن ہوس رنگ و بو کریں

ہے اپنی یہ صلاح کہ سب زاہدان شہر
اے درد آکے بیعت دست سبو کریں

کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے — تہمت چند اپنے ذمہ دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں — چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
اس نے قصداً کبھی میرے نالہ کو — نہ سنا ہوگا گر سنا ہوگا

دیکھئے غم سے رہ کے جی میرا
نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا

دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم
کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا

حال مجھ غمزدے کا جس تس نے
جب سنا ہوگا رو دیا ہوگا

یک بیک نام لے اٹھا میرا
جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا

میرے نالوں پہ کوئی دنیا میں
بن کئے آہ کہہ رہا ہوگا

لیکن اس کو اثر خدا جانے
نہ ہوا ہوگا یا ہوا ہوگا

قتل سے میرے وہ جو باز رہا
کسی بدخواہ نے کہا ہوگا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے
زباں تب تلک ہے یہی گفتگو ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا
میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے

تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا
تری آرزو ہے اگر آرزو ہے

کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا
گل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے

کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں
مجھے اپنے رونے سے ہی آبرو ہے

غنیمت ہے یہ دید وا دید یاراں
جہاں آنکھ مند گئی نہ میں ہوں نہ تو ہے

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

متفرق اشعار

ہو گیا دھما لسرا ئے کثرت موہوم آہ
وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا

وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ذکر تیرا تو وہ کرتا تھا صریحاً لیکن
میں نے پوچھا تو کہا یہ دستور نہ تھا

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

مَیں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات
پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

درد ہم کو یہ رات دن تیرا
نالۂ زار خوش نہیں آتا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا
میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

ہے کو نسی اجل کی طرف ورنہ میں

اک عمر سے اسیر ہوں زلف دراز کا
پھرتی ہے میری خاک صبا دربدر لئے
اے چشم اشکبار یہ کیا تجھ کو ہو گیا
وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا
یعنی کبھو تو اپنے بھی دل تھا دماغ تھا
صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو
ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک
ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کئے
جی میں ہے خوب رویئے اب بیٹھ کر کہیں
اپنے بندہ پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو
پر نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو
نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے
دوستو درد کو محفل میں نہ تم یاد کرو
اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے
لوح مزار بھی مری چھاتی کا سنگ ہے

انشا

سید انشاء اللہ خاں نام ۔ انشاء تخلص ۔ باپ کا نام حکیم میر ماشاء اللہ تھا ۔ ان کے بزرگ نجف اشرف سے آکر ہندوستان میں رہنے لگے ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ کشمیر کے سیّدوں میں سے تھے ۔ وہاں کسی زمانہ میں سمرقند سے آئے تھے ۔ پھر وہاں سے آکر دلّی میں رہنے لگے۔

میر انشاء اللہ مرشد آباد میں پیدا ہوئے ۔ ان کے باپ پڑھے لکھے آدمی تھے ۔ انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم کی طرف زیادہ توجّہ کی ۔ یہ بھی بلا کے ذہین تھے ۔ تھوڑے ہی دنوں میں فارسی اور پھر عربی میں خاصی قابلیت پیدا

کرلی۔ طب بھی پڑھی تھی ❊

شاعری میں پڑے۔ تو قیامت برپا کردی۔ عربی۔ فارسی اردو۔ سبھی زبانوں میں کہہ ڈالا ❊ یہ شاگرد کسی کے بھی نہ تھے۔ ابتدا میں باپ کو کلام دکھایا تھا ❊

ہندوستان کی تباہی کے زمانہ میں یہ مرشد آباد سے دلی آئے۔ اس وقت شاہ عالم بادشاہ تھے۔ انہوں نے انشا کو اپنے دربار میں رکھ لیا ❊ یہاں یہ بہت ہنسی خوشی رہے۔ یہاں کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہوئے اور اس زمانہ کے شاعروں سے خوب نوک جھونک رہی ❊

مشاعرہ میں بادشاہ بھی اپنی غزل بھیجا کرتے تھے۔ لوگ ان کی غزل کا مذاق اڑایا کرتے ہوں گے ❊ انشا نے جا کر حضور کی خدمت میں عرض کی۔ کہ فلاں فلاں شخص حضور کی غزل پر مذاق اڑاتے ہیں ❊ بادشاہ کو بُرا معلوم ہُوا۔ اور انہوں نے صرف اتنا کیا کہ اپنی غزل بھیجنا بند کردی ❊ لوگوں کو خبر لگ گئی۔ ان کو بہت رنج ہوا ❊ چنانچہ اس کے بعد جب مشاعرہ ہوا تو ایک صاحب نے جن کا نام ولی اللہ محب تھا۔ یہ قطعہ پڑھا ؎

مجلس میں چپکے چاہئے جھگڑا شعرا کا ایسے ہی کسی صاحب نے قبر کے آگے
یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا اکبر تئیں بادشاہ جہانگیر کے آگے

ایک صاحب مرزا عظیم بیگ تھے۔ انھوں نے اپنے حسب
حال اپنے استاد کے شعر پر تضمین کی تھی۔ وہ پڑھی ؎

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا
طرف ہر ایک سے یہ بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا
کئی سکھن باز کھنڈ گویوں میں ہو نہ ہو اعتبار اپنا
جنہوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں دیا انہیں کو وقار اپنا
عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالا جو بار اپنا

اب کیا تھا۔ دریا میں طوفان آگیا۔ سیّد انشاء فخریہ
غزل کہہ کر لائے تھے۔ وہ پڑھی۔ جس کا ہر شعر بم کے گولے
کا کام کرتا تھا ؎

ایک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے
کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے
کیا مال بھلا قصر فریدوں مرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے
مرغان اولی اجنحہ مانند کبوتر

کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے

منہ دیکھو جو نقارچیِ پیر فلک بھی
نقارہ بجا کر کے دُوں دُوں مرے آگے

ہوں وہ جبر دنی کہ گروہ حکما سب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے

بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

مجرے کو مرے خسرو پرویز ہو حاضر
شیریں بھی کہے آکے بلا لوں مرے آگے

کیا آکے ڈرا دے مجھے زلف شب یلدا
ہے دیو سفید سحری جوں مرے آگے

وہ مار فلک کا ہکشاں نام ہے جس کا
کیا دخل جو بل کھا کے کرے فوں مرے آگے

ان کے پڑھ چکنے کے بعد حکیم میر قدرت اللہ خاں قاسم کے سامنے شمع آئی۔ انہوں نے اتنا کہا کہ سید صاحب ذرا اس الفیل ما الفیل کو (یعنی بے معنی باتیں) بھی سننا اور ایسا خیال کر کے کہ کہیں ایسا نہ ہو شریفوں میں بے

لطف بڑھ جائے۔ اٹھے۔ اور ان دونوں کو گلے ملوا دیا۔ اور یوں صلح ہو گئی ۞

دلی میں اس وقت کے بادشاہ کو شطرنج کا بادشاہ سمجھنا چاہئے۔ لیکن سید انشا اپنا مطلب کسی نہ کسی طرح نکال ہی لیا کرتے تھے۔ مثلاً جمعرات کا دن ہوتا۔ تو باتیں کرتے کرتے کہتے کہ حضور! اجازت ہے۔ غلام "نبی کریمؐ" ہو آئے۔ شاہ عالم کہتے "ہاں ہاں بھئی! ضرور جاؤ۔ میرے لئے بھی کچھ عرض کرنا" یہ کہتے "حضور! غلام کی اور کونسی آرزو ہے۔ حضور ہی کے لئے جا رہا ہوں" یہ کہہ کر پھر چپ ہو جاتے بادشاہ پھر باتیں کرنے لگتے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ پھر اجازت مانگتے تو بادشاہ کہتے "ہیں انشا! ابھی تم گئے نہیں" یہ کہتے "حضور! ایسے بڑے بادشاہ کی درگاہ میں غلام خالی ہاتھ کیا جائے۔ کچھ نذر و نیاز کے لئے بھی تو عنایت فرمایئے" بادشاہ کہتے "ہاں ہاں۔ ضرور ضرور" جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپے نکال کر دیتے۔ انشا لے لیتے اور دو چار دعائیں دے کر کہتے "حضور! دوسری جیب میں بھی ہاتھ جائے تو فدوی کا کام چلے۔ کیونکہ وہاں سے

پھر کر بھی تو آنا ہے" + بادشاہ کہتے "وہاں بھی سچ ہے۔ بھلا وہاں سے دو دو کھجوریں تو کسی کو لا کر دو۔ بال بچے کیا جانیں گے کہ آج تم کہاں گئے تھے +

اگرچہ ان فقروں سے یہ کام نکال لیتے تھے۔ مگر پھر بھی کب تک۔ آخر جوانی کی امنگوں نے دلّی سے دل اُچاٹ کر دیا۔ تو لکھنؤ جا کر مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں پہنچے + وہ شاہ عالم بادشاہ کے بیٹے تھے۔ انہوں نے اپنے باپ کا نمکخوار سمجھ کر ان کی سرپرستی کی۔ اور انہیں اپنی غزلیں اصلاح کے لئے دکھانے لگے +

مرزا سلیمان شکوہ کا مکان دریا کے کنارے تھا + انشا کو معلوم ہوا کہ کل دریا پر اشنان کا ایک میلا لگے گا۔ پھر کیا تھا۔ رنگت کے گورے بدن کے موٹے تازے تو تھے ہی کشمیری پنڈتوں کا لباس پہن۔ پوجا پاٹ کا سامان لے۔ صبح کو سب سے پہلے دریا کے کنارے مہنت بن کر بیٹھ رہے۔ اور ہل ہل کر منتر جپنے اور مالا پھیرنے لگے۔ لوگوں کا نہانے کے لئے جماؤ شروع ہو گیا + عورت۔ مرد۔ بچہ۔ بوڑھا جو کوئی بھی آتا۔ پہلے ان کی طرف جھکتا + یہ انہیں پوجا

کراتے۔ منتر پڑھاتے اور ماتھے پر تلک لگاتے + جن دوستوں کو یہ راز معلوم تھا۔ انہوں نے جاکر مرزا سلیمان شکوہ کو خبر کی + وہ اپنے سب لوگوں کو لے کر کوٹھے پر چڑھے + دیکھتے ہیں تو سچ مچ عجیب روپ بھرے بیٹھے ہیں۔ سامنے اناج آٹا۔ پیسے۔ کوڑیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں +

ایسا کرنے سے انشا کا ایک مطلب بھی تھا۔ وہ مرزا سلیمان شکوہ کو دکھا دینا چاہتے تھے۔ کہ میں کسی بات میں بند نہیں ہوں۔ کبھی بھوکوں نہیں مر سکتا۔ جس کوچہ میں نکل جاؤں گا۔ اچھا ہی رہوں گا +

آپ مرزا سلیمان شکوہ کے پاس تو رہتے ہی تھے۔ لیکن دوسری فکریں بھی کرتے رہتے تھے۔ آخر کار تفضل حسین علامہ کی سفارش سے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی ہو گئی + یہ وہاں ایسے گھُل مل گئے کہ نواب کو ان کے بغیر ایک دم بھی چین نہ پڑتا تھا لیکن نواب قدرتی طور سے بھاری بھرکم آدمی تھے اور اپنے آپ کو لئے دئے رہتے تھے۔ پھر ان باتوں پر بادشاہت کے کاموں کی فکریں۔ دوسری طرف انشا انتہا درجہ کے

ہنسوڑ۔ بیفکرے۔ اس لئے نواب کے ساتھ زیادہ دنوں
تک نہ نبھ سکی + ۱۲۲۵ھ میں نواب نے دربار سے نکال دیا
اور آخر وقت تک یہ گھر میں بند رہے ۔ نواب کے حکم کے
بموجب یہ نہ کہیں آسکتے تھے اور نہ کہیں جا سکتے تھے ۔
جب نواب خود بلاتے تھے ۔ اس وقت یہ دربار میں جاتے
تھے + اسی حالت میں ۱۲۳۳ھ کو لکھنؤ میں انتقال کیا +
کسی کا قول ہے کہ انشا کی قابلیت اور لیاقت کو
شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کے پاس
ہر وقت بیٹھنے نے ڈبویا +
ایک دن نواب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے
اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی + مُنڈا ہوُا
سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں شوخی پیدا ہوئی ۔ ہاتھ بڑھا
کر پیچھے سے ایک دھول ماری + آپ نے جلدی سے
ٹوپی سر پر رکھ لی اور بولے "سبحان اللہ بچپن میں بزرگ
سمجھایا کرتے تھے ۔ وہ بات سچ ہے کہ جو ننگے سر کھانا کھاتے
ہیں ۔ ان کو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے +
سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے تھے ۔ میر

انشاء اللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا تھا۔ سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے + دریا کے کنارے ایک حویلی پر لکھا دیکھا:۔

حویلی علی نقی خاں بہادر کی

کہا ؔ انشا، ا دیکھو۔ کسی نے تاریخ کہی۔ مگر پوری نہ کر سکا۔ تم اسے پورا کر کے رباعی کر دو + اُسی وقت عرض کی۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکی حویلی علی نقی خاں بہادر کی

ان کی غزلوں کا دیوان ایک طلسم خانہ ہے۔ زبان پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ہر ایک مضمون کو نہایت خوبی سے بیان کرتے تھے + محاوروں کی نمکینی۔ ترکیبوں کی اچھی اچھی تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں اور ابھی کچھ + جو شعر قاعدے کے مطابق کہہ گئے ہیں ان کا جواب نہیں۔ اور جہاں طبیعت ادھر طرف جا پڑی۔ وہاں پھر ٹھکانا نہیں + غزلوں میں قاعدے کی پابندی نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ من میں ہوتا۔ وہی کہتے تھے + ہندوستان کی بہت سی زبانیں ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ سب

زبانوں میں کچھ نہ کچھ کہا کرتے تھے ؛

قصیدے بڑے زور شور کے کہے ہیں۔ جن میں الفاظ بڑی دھوم دھام کے ہوتے تھے۔ طبیعت تو بلا کی تھی۔ بڑی دور کی کوڑی لاتی تھی۔ مگر سیدھے چلتے چلتے ایسی چال بدلتے تھے کہ انسان حیران رہ جاتا تھا۔ کسی جگہ اگر ان کو کوئی شوخ مضمون یا اچھی سی ترکیب اور نئی تراش سوجھ جاتی تھی۔ تو وہ اسے باندھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اس طرح کبھی تو کلام میں شوخی اور ایک قسم کا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی بھونڈا پن بھی آجاتا ہے۔ لیکن زبان کا مزہ کسی طرح نہیں جاتا۔ مزہ تو اس وقت آتا ہے۔ جب اردو قصیدہ کہتے کہتے فارسی۔ عربی۔ ترکی۔ بھاشا۔ پنجابی اور نہ معلوم کیا کیا۔ اور کن کن زبانوں میں شعر کہہ جاتے ہیں ؛

مثنویاں بھی انھوں نے کئی کہی تھیں۔ بہاءالدین آملی کی مثنوی نان و حلوا کے جواب میں "شیر و برنج" تیار کی۔ جو نہایت مزیدار ہے۔ نواب سعادت علی خاں کے شکار کا حال ایک مثنوی میں لکھا ہے۔ مگر زیادہ توجہ اردو

کی طرف رہی اور اسی میں ان کو شہرت حاصل ہوئی*
ان دو مثنویوں کے علاوہ ایک عاشقانہ مثنوی بھی ہے
یہ ایک چھوٹی سی مثنوی ہے۔ جس میں ایک انگریزی حکایت "ایک ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی" کو نظم کیا ہے۔ اس میں جو شادی کا حال لکھا ہے۔ اس کے سامان کا تماشا دیکھنے کے قابل ہے*

ان کے یہاں ہندی اور ملکی باتوں کے مضمون بہت اچھی طرح سے باندھے گئے ہیں۔ چند شعر اسی قسم کے یہاں لکھے جاتے ہیں ؎

لیا گر عقل نے منہ میں دل بیتاب کا گٹکا
تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا
صنم خانہ میں جب دیکھا بت و ناقوس کا جوڑا
لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا
لپٹ کر کشن جی سے رادھکا ہنس کر لگی کہنے
ملا ہے چاند سے اپنا اندھیرے پاکھ کا جوڑا
یہ سچ سمجھو کہ انشا ہے جگت سیٹھ اس زمانہ کا
نہیں شعر و سخن میں کوئی اس کی ساکھ کا جوڑا

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا
ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا
سنایا رات کو قصّہ جو ہیر رانجھا کا
تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

غرض تمام تصنیفوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے ہر رنگ میں کہا ہے + اگرچہ بعض باتیں اصل میں ان کی سینہ زوری کی ہیں ۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ باتیں لوگوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں +

ان کا پڑھنا بھی ایک خاص طرز کا تھا۔ جس سے شعر کی شان اور کلام کا لطف دُونا ہوجاتا تھا + دیوان دیکھنے سے ان کے حالات اور عادات کی تصویر کھنچ جاتی ہے + وہ مشاعرہ میں آتے تھے۔ یا دربار میں جاتے تھے۔ تو ان کی ہر بات۔ ہر حرکت لوگوں کو ہنستے ہنستے لٹا لٹا دیتی تھی +

کلام کا نمونہ :-

قصیدہ

بگھیاں پھولوں کی تیار کرا سے یوسے سمن

کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے خواہان چمن
عالم اطفال نباتات پہ ہوگا کچھ اور
گورے کالے سبھی پہنیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر
کرسی ناز پہ جلوہ کی دکھا دے گا پھبن
شاخ نازک سے کوئی ہاتھ میں لیکر اک بیت
ہو الگ سب سے نکالے گا نرالا جوبن
نسترن بھی نئی صورت کا دکھا دے گا رنگ
کوچ پر ناز کے جب پاوں رکھے گا بن ٹھن
اپنے گیلاس شگوفہ بھی کریں گے حاضر
آگے جب غنچۂ گل کھولیں گے بوتل کے دہن
اہل نظارہ کی آنکھوں میں نظر آویں گے
باغ میں نرگس شہلا کے ہوائے چتون
اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے
اودی بانات کی کرتی ہے شکوہ سوسن
پتے ہل ہل کے بجادیں گے فرنگی طنبور
لالہ لاوے گا سلامی کو بنا کر پلٹن

کھینچ کر تار لگ ابرِ بہاری سے گئی
خود نسیمِ سحر آوے گی بجانی ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلا دیں گے
آپڑے گی جو کہیں نظر پہ سورج کی کرن
نے نوازی کے لئے کھول کر اپنی منقار
آکے دکھلا دے گی بلبل بھی جو ہے اس کا فن
اردلی کے جو گراں ڈیل ہیں ہونگے سب جمع
آن کر اپنا بگل پھونکے گا جب سکھلاشن
آلے گا نذر کو شیشہ کی گھڑی لیکے حباب
یاسمن پتوں کی پینس میں چلے گی بن ٹھن
نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرہ
ساتھ ہولے گی نزاکت بھی جو ہے اسکی بہن
حوض صندوق فرنگی سے مشابہ ہوں گے
اس میں ہووینگے پریزاد بھی سب عکس فگن

غزل

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے اب کہ پہروں تک
نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل آہ ننگ و نام کیا شے ہے
میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردن فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

جو چاہے تو مجھ سے ہنسوڑے کی خیر تو یوں دیکھ اس گھوڑے جوڑے کی خیر
کدا دے نشہ کے مرے رخش کو میاں ساقی اس سلفے کوڑے کی خیر

دکھائی مجھے سیر باغ ارم الٰہی ہوا اس سبزہ گھوڑے کی خیر
ہنسایا جو میں نے تو بولے نہیں نظر آتی کچھ اس نگوڑے کی خیر

لگا بیٹھ انشا کو ٹھوکر تو ایک
ارے اپنے سونے کے توڑے کی خیر

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام الٹا
تو کیا بہک کے میں نے اسے اک سلام الٹا

سحر ایک ماش پھینکا مجھے جو دکھا کے ان نے
تو اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظ شام الٹا

بڑھوں اس گلی سے کیونکر کہ وہاں تو میرے دل کو
کوئی کھینچتا ہے ایسا کہ پڑے ہے گام الٹا

مجھے کیوں نہ مار ڈالے تری زلف الٹ کے کافر
کہ سکھا رکھا ہے تو نے اسے لفظ رام الٹا

تو جو باتوں میں رکے گا تو یہ جانوں گا کہ سمجھا
مری جان و دل کے مالک نے مرا کلام الٹا

فقط اس لفافہ پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اس نے انشا یہ ترا ہی نام الٹا

متفرق اشعار

دل لگایا ہے کہیں انشا نے شاید دوستو
ان دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا
غصے میں ترے ہم نے عجب لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے
دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا
ہنوز کہتی ہے جنہا سہاگ دکھلا کر
کہ خوب کھیلے تمہارا ج بھاگ پائی پر
گر نازنیں کہے سے برا مانتے ہیں آپ
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی
کہہ تو اے چرخ بھلا تجھ سے کسی طرح کبھی
دل کے ارماں ہمارے بھی نکل سکتے ہیں
دل میں سما رہا ہے یوں داغ عشق اپنے
جس طرح کوئی بھونرا ہووے کنول پہ بیٹھا
گرہ حسرت کی ہر تار نفس میں پڑ گئی جس سے

یہ کیسی ہوک ہر دم اے دل پر درد اٹھتی ہے
ہوئی امید حاصل شکر جاۓ گر یہ ہے لیکن
کہ رخصت کے لئے اب یاس غم پر درد اٹھتی ہے

حیف ایّام جوانی کے چلے جاتے ہیں
ہر گھڑی دن کی طرح ہم تو ڈھلے جاتے ہیں

بستی تجھ بن اجاڑ سی ہے
کم بخت یہ شب پہاڑ سی ہے
شاید کہ ہوئی سرایت عشق
کچھ سینہ میں چھیڑ چھاڑ سی ہے

آہ کو مت حقیر جان ...ہی
دود ماں اثر کی پونجی ہے

میر حسن

میر غلام حسن نام، حسن تخلص۔ میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے + ان کے باپ دادا ہرات کے رہنے والے تھے + میر حسن کے دادا امام ہروی نے زمانہ کے انقلاب کے ہاتھوں وطن چھوڑ کر پرانی دلی بسائی۔ یہیں میر ضاحک پیدا ہوئے + میر حسن کا ابتدائی زمانہ یہیں بسر ہوا + بارہ برس کے سن میں باپ کے ساتھ فیض آباد آ گئے۔ کچھ دنوں وہاں رہ کر لکھنؤ میں آ بسے + شاعری باپ دادا سے ملی تھی اودھ میں آکر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہو گئے۔ مگر ان کے طریقہ پر نہ چل سکے۔ میر درد۔ مرزا رفیع سودا اور

میر تقی میر کے کلام کی پیروی کی ✤

۱۲۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ مفتی گنج لکھنؤ میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے۔ مصحفی نے "شاعر شیریں زباں" سے تاریخ نکالی ✤

ان کے تین بیٹے تھے۔ میر مستحسن خلیق۔ میر احسن خلق اور میر محسن محسن۔ ان سب کا قیام فیض آباد میں رہتا تھا ✤

یہ اپنے باپ دادا کے برخلاف ڈاڑھی منڈاتے۔ پگڑی اگلے لوگوں کی طرح باندھتے اور پوشاک اپنے باپ کی سی پہنتے تھے۔ یعنی سبز عمامہ اور بڑا جبّہ۔ قد لمبا تھا۔ رنگ بھورا۔ نہایت اچھی عادت کے اور ہنس مکھ تھے۔ بیہودہ کلام کبھی اپنے منہ سے نہ نکالتے۔ پڑھے لکھے آدمی تھے اور فارسی میں اچھی قابلیت تھی ✤

ان کے کلیات میں غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ واسوخت ہجو۔ رباعی سب ہی کچھ ہیں۔ غالباً مرثیے بھی انھوں نے کہے تھے جو چھپے نہیں ✤

غزلوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان میں ان کا رتبہ بہت بلند ہے۔ غزلیں قریب پانسو ہونگی۔ مشکل

بات کو یہ پسند نہیں کرتے تھے۔ استعارہ وغیرہ کا اہتمام
ان کے یہاں نہیں۔ کلام صاف اور مزیدار ہے۔ کہیں
کہیں تصوف کی بھی جھلک پائی جاتی ہے + غزلیں چھوٹی
چھوٹی ہیں۔ اور ہر غزل میں دو ایک شعر ضرور دل کو بھا جاتے
ہیں۔ چھوٹی بحروں میں زیادہ تر اچھے شعر کہے ہیں بعض
وقت مشکل زمینوں میں بھی صاف اور دل پسند غزلیں
لکھی ہیں +

قصیدے بھی اچھے ہیں۔ جو باتیں قصیدے میں ہونا
چاہئیں۔ ان کی انہوں نے پابندی کی ہے۔ کلام میں شکوہ
ہے۔ بندشیں چست ہیں۔ زبان غزل سے زیادہ صاف
ہے۔ اکثر اچھے اچھے مضمون پیدا کئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے
کہ قصیدہ میں مرزا سودا کی پیروی کی ہے + دو قصیدے
منقبت میں ہیں۔ باقی نواب آصف الدولہ اور دوسرے
امیروں کی مدح میں +

مثنویاں بھی کئی ہیں + ایک مثنوی گلزار ارم ہے۔ اس
میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی تعریف جی کھول کر کی ہے
شاید اسی وجہ سے یہ مشہور نہیں ہوئی + دوسری مثنوی

تصوف میں ہے۔ اس کا نام رموز العارفین ہے۔ یہ ۱۱۸۸ھ میں لکھی گئی تھی + تیسری مثنوی سحر البیان ہے۔ جس کو عام طور سے لوگ مثنوی بدر منیر کہتے ہیں۔ یہی وہ مثنوی ہے جس سے ان کو شہرت حاصل ہوئی + اس کی زبان نہایت صاف ہے۔ محاورہ کا لطف۔ مضمون کی شوخی۔ طرز ادا کی نزاکت اور سوال وجواب کی نوک جھونک کی تعریف نہیں کی جاسکتی + اس مثنوی کو ڈیڑھ سو سال ہونے کو آئے ہیں۔ لیکن اس کی زبان قریب وہی ہے۔ جو آج کل بولی جاتی ہے + یہی وجہ ہے کہ عام طور سے لوگ اس کو پسند کرتے ہیں +

اگر اس بات کو چھوڑ دیا جائے کہ پرانے قصوں کی طرح اس مثنوی کی بنیاد بھی دیو پری کے افسانوں پر رکھی گئی ہے۔ تو یہ کہنا بالکل درست ہے۔ کہ میر حسن نے قصہ نگاری کی تمام ضروری باتوں کو پورے پورے طریقہ سے ادا کر دیا ہے + سلطنت کی شان وشوکت۔ تختگاہ کی رونق اور چہل پہل۔ بے اولادی کی حالت۔ جوتشیوں کی گفتگو۔ شاہزادہ کی پیدائش اور اس کی چھٹی + ناچ رنگ اور گانے بجانے

کے ٹھاٹھ۔ باغوں اور ہر قسم کی محفلوں کے سمے + سواریوں کے جلوس۔ حمام میں نہانے کی کیفیت۔ مکانوں کی سجاوٹ۔ شاہی لباس وغیرہ کا بیان۔ خوابگاہ کا نقشہ۔ جوانی کی نیند کا عالم۔ رنج اور غم کی حالت میں محلوں اور باغوں کی بے رونقی۔ محبت کا بیان۔ خوبصورتی کا حال۔ جدائی کا بیان۔ مصیبتوں کا بیان۔ خوشی کا بیان۔ نسبت کے پیام وسلام بیاہ شادی کے سامان۔ بچھڑے ہوؤں کا ملنا اور ایسی حالت کا نقشہ۔ غرضکہ جو کچھ اس مثنوی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی تصویر سامنے کھینچ دی ہے۔ اور مسلمانوں کے اخیری زمانہ میں بادشاہوں اور امیروں کے یہاں جو حالتیں ایسے موقعوں پر گزرتی تھیں اور جو باتیں پیش آتی تھیں۔ ان کا بالکل ویسا ہی چربہ اتار دیا ہے +

پہلے ان کی چند غزلوں کو یہاں لکھا جاتا ہے پھر مثنوی کا نمونہ پیش کیا جائے گا:۔

غزلیں

دل غم سے ترے لگا گئے ہم   کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

ماتمکدہ جہاں میں جوں شمع
رو رو کے جگر بہا گئے ہم

مانند حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

کھویا گیا اس میں گو دل اپنا
پر یار تجھے تو پا گئے ہم

آتا ہے یہی تو ہم کو رونا
یوں موت کا غم بھلا گئے ہم

افسانہ سرگذشت جوں شمع
رو رو کے بہت سنا گئے ہم

تھا ہم میں اور اس میں وہ جو پردہ
سو اس کو حسن اٹھا گئے ہم

آج دل بیقرار ہے کیا ہے
درد ہے انتظار ہے کیا ہے

جس سے جلتا ہے دل جگر وہ آہ
شعلہ ہے یا شرار ہے کیا ہے

یہ جو کھٹکے ہے دل میں کانٹا سا
مژہ ہے نوک خار ہے کیا ہے

چشم بد دور تیری آنکھوں میں
نشہ ہے یا خمار ہے کیا ہے

میرے ہی نام سے خدا جانے
ننگ ہے اس کو عار ہے کیا ہے

کیوں گریباں تیرا آج حسن
اس طرح تار تار ہے کیا ہے

مثنوی

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ

عمارت میں خوبی دروں کی وہ شان | لگے جس میں زر بفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار | دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے دریہ اٹکا ہوا | کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر | کہ مہ کا بندھے جس سے تار نظر
چقوں کا تماشہ تھا آنکھوں کا جال | نگہ کو وہاں سے گزرنا محال
سنہری مغرق چھتیں ساریاں | وہ دیوار اور در کی گلکاریاں
دیئے ہر طرف آئینے جو لگا | گیا چوگنا لطف اس میں سما
وہ مخمل کا فرش ایسا ستھرا کہ بس | بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
رہیں لخلخے اس میں روشن مدام | معطر شب و روز جس سے مشام
چھپر کھٹ مرصع وہ دالان میں | چمکتا دمکتا تھا ہر آن میں
زمیں پر تھی اسطور اسکی جھلک | ستاروں کی جیسے فلک پر چمک
زمیں کا کروں اسکی کیا میں بیاں | کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگ مرمر کی چوپڑ کی نہر | گئی چارسو اس کے پانی کی لہر
کھڑے تھے قرینے سے سرو سہی | ذرا دور دور اُن سے سیب و بہی
کہوں کیا میں کیفیت داربست | لگائے رہیں تاک واں مے پرست
ہوائے بہاری سے گل لہلہے | چمن سارے شاداب اور ڈہوندھے
زمرد کی مانند سبزہ کا رنگ | روش پر جواہر لگا جیسے سنگ

روش کی صفائی پہ لے اختیار | گل اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے ہرا باغ گل سے چمن | کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا | کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا
کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشاں | ملن بان کی اور ہی آن بان
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار | جُدی اپنے موسم میں سبکی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں | سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار | کہ ہر اک سفیدی سے مہتاب وار
کھڑے سرو کی طرح چنپا کے جھاڑ | کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن | عجب رنگ کے زعفرانی چمن
پڑا آب جو ہر طرف کو بہے | کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا | اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیاباں پر | نشے کا سا عالم گلستاں پر
لئے ہاتھ میں بیلچے ماتیں | چمن کو نگہیں دیکھنے بھالنیں
کہیں تخم پاشی کریں گود کر | پنیری جمادیں کہیں کھود کر
کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال | رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال
لب جو پہ آئینے میں دیکھ قد | اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ تد
خراماں صبا صحن میں چار سو | دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو

کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے — لئے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور — درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتش گل سے دہکا ہوا — ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کرکے پھول — پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
وہ کیلونکی اور مولسریوں کی چھاؤں — لگی جائیں آنکھیں تلے جنکے ناؤں
خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں — تعیش سے آپس میں باتیں کریں
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق — کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق

سماں قمریاں دیکھ اس آن کا
پڑھیں باغ پنجم گلستاں کا

بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز — چڑھا بیاہنے وہ مہ شب فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار — بجے شادیانے بہم ایک بار
کوئی دوڑ گھوڑے کو لانے لگا — کوئی ہاتھیوں کو بٹھلانے لگا
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے — سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
ٹکورے وہ نوبت کے اور انکے بعد — گرجنا وہ دھونسوں کا مانند رعد
دو رویہ جو روشن چراغاں ہوئے — تلنگے خوشی سے غزلخواں ہوئے
براتی ادھر اور ادھر جوق جوق — وہ آواز سرنا وہ آواز بوق
وہ ابرک کی ٹٹی وہ بیلنے کے جھاڑ — کہے تو کہ تنکے سے اوجھل پہاڑ

انا روں کا دغنا بھبھنے کا زور
ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور

وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار
ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار

جب آئی وہ دلہن کے گھر پر برات
کہوں اُس کے عالم کی کیا تجھ سے بات

بلوریں دھرے شمعداں بےشمار
چڑھیں بتّیاں موم کی چار چار

نئے رنگ کے اور نئے طور کے
دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے

تماشائیوں کی یہ کثرت کہ بس
ملے ایک سے ایک سب پیش و پس

وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا
برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا

ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان
پلا سب کو شربت دیئے ہار پان

وہ سب ہو چکے جب رسم و رسوم
سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم

سحر کا وہ ہونا وہ ٹوٹنے کا وقت
وہ دلہن کی رخصت وہ رونیکا وقت

وہ دولہن کا رو رو کے ہونا جدا
وہ ماں باپ کا اور رونا جدا

نکلتے وہ جانا محل سے جہیز
کہ جوں چشم سے اشک ہو موج خیز

یہاں موت ہے اہل عرفاں کو
کہ جانا ہے اک دن یونہی جان کو

وہ جو دردمندی سے ہیں آشنا
وہ شادی کا لیتے ہیں غم سے مزا

زبس تھا سواری کا باہر ہجوم
ہوا جبکہ ڈنکا پڑی سب میں دھوم

برابر برابر کھڑے تھے سوار
ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار

سنہری رو پہلی وہ عماریاں
شب و روز کی سی طرحداریاں

چمکتے ہوئے بادلے کے نشاں | سواروں کے غٹ دربانوں کی شاں
ہزاروں ہی اطراف میں پالکی | جھالا بور کی جگمگی نالکی
کہاروں کی زربفت کی کرتیاں | اور انکے ڈبلے پاؤں کی پھرتیاں
بندھیں پگڑیاں طاش کی سر اوپر | چکاچوندھ ہیں جس سے آئے نظر
وہ ہاتھوں میں سونے کے موٹے کڑے | جھلک جن کی ہر ہر قدم پر پڑے
وہ ماہی مراتب وہ تخت رواں | وہ نوبت کہ دولہا کا جیسے سماں
وہ شہنائیوں کی صدا خوش نما | سہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا
وہ آہستہ گھوڑوں پہ نقارچی | قدم با قدم با لباس زری
بجاتے ہوئے شادیانے تمام | چلے آگے آگے لیے شاد کام
سوار اور پیادے صغیر اور کبیر | جلو میں تمامی امیر اور وزیر
وہ نذریں کہ جن جن نے تھیں ٹھانیاں | شہ و شاہزادہ کو گزرانیاں
ہوئے حکم سے شاد کے پھر سوار | چلے سب قرینے سے باندھے قطار
سجے اور سجائے سبھی خاص و عام | لباس زری میں ملبس تمام
طرف کے طرف اور پیچھے کے پرے | کچھ ادھر اُدھر کچھ وہ کچھ پرے
وہ فیلوں کی اور میگ ڈمبر کی شان | جھلکتے وہ منقش کے سائباں
جہاں پایۂ تخت ہو گئے قریب | بدستور شاہانہ پہنچی جریب
سواری کے آگے پہنچے اہتمام | لیے سونے روپے کے عاصے تمام

نقیب اور جلودار اور چوبدار — یہ آپس میں کہتے تھے ہر دم پکار
اسی اپنے معمول و دستور سے — ادب سے تفاوت سے اور دور سے
چلو نوجوانو بڑھے جا ہو — دو جانب سے باگیں لئے آ ہو
بڑھے جائے آگے سے چلتے قدم — بڑھے عمر و دولت قدم با قدم
غرض اس طرح سے سواری چلی — کہے تو کہ بادِ بہاری چلی
تماشائیوں کا ہوا تھا ہجوم — کہ ہر طرف تھی لاکھ عالم کی دھوم
لگا قلعہ سے شہر کی حد تلک — دکانوں پہ تھی بادلے کی جھلک
کیا تھا زمیں شہر آئینہ بند — ہوا چوک کا لطف واں چار چند
رعیت کی کثرت ہجوم سپاہ — گزرتی تھی اک اک کے سر جا نگاہ
ہیولے جمع کوٹھوں پہ جو مرد و زن — ہر اک سطح تھی جوں زمینِ چمن
لگا نیچ سے تا نجیب و ضعیف — تماشے کو نکلے وضیع و شریف
نظر جس کو آیا وہ ماہِ تمام — کیا اس نے جھک جھک کے اس کو سلام

دعا شاہ کو دی کہ یا رب الٰہ
سدا یہ سلامت رہیں مہر و ماہ

متفرق اشعار

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو

حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا
ہیں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جانے سے تیرے
برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور
پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ — بس آج کی شب بھی سو چکے ہم!
دل کو کھویا ہے کل جہاں جاکر — جی میں ہے آج جی بھی کھوآؤں
ناز سے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں
مزے نہ دیکھے کبھی ہم نے زندگانی کے
یونہی گزر گئے افسوس دن جوانی کے
حسن دیتا ہے تو کیوں جی بتوں پر
ملا دیں گے تجھے یہ کیا خدا سے
اس بت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسن
یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بری لگے
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا
پس اے زندگی ایسی ہستی سے گزرے

آرزو اور تو کچھ ہم کو نہیں دنیا میں
ہاں مگر ایک ترے ملنے کا ارماں تو ہے

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا روسکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

عیش وصال و صحبت یاراں فراغ دل
اس ایک جاں کے لئے کیا کیا نہ چاہیے

آغاز محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا
کیا جانیے کیا ہوگا انجام مرے دل کا

کیا جانے اس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا
کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گزرا

جس عالم ہستی کو سمجھتے تھے بہار آد
آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم ہے خزاں کا

نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں
لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

دل جلایا بھڑک جگر اُٹھا   دیکھیو شعلہ یہ کدھر اٹھا

یک بیک دل پہ کیا غضب ٹوٹا　　پھر یہ کچھ آہ سرد بھر اٹھا

یہ تھی کس عندلیب کی تربت　　جس کا گل ہی سدا چراغ رہا

وصل ہوتا ہے جنکو دنیا میں　　یارب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں

تھا ہجر ہی بھلا کہ تھی اس میں امید وصل

پھر ہجر کا خیال بندھا وصل یار میں

کیسا وصال کس کا فراق اور کہاں کے عشق

تھی عالم جوانی کی بس یہ بھی اک ترنگ

خیال رہتا ہے جو اس کوچہ میں اکثر اپنا

گھر میں رہتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں گھر اپنا

آہ کیا جانئے محفل میں یہ کس کی خاطر

شمع روتی ہے جدا جلتا ہے پروانہ جدا

پیام میر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا

زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

کوئی دم کے ہیں مہماں اس چمن میں ایکدم آخر

مثال نکہت گل شام جانا یا سحر جانا

کسی نے بات کہی اور رو دیا اس نے

یہ حال اب دل زار و نزار کا پہنچا

شمع ساں شب کے مہماں ہیں ہم صبح ہوتے ہی پھر کہاں ہیں ہم

نہ کسی کی سنیں نہ اپنی کہیں نقش دیوار بوستاں ہیں ہم

کسی موسم کی وہ باتیں جو تیری یاد کرتا ہوں

انہیں باتوں کو پھر پھر کر دل اپنا شاد کرتا ہوں

اس کے کوچہ میں صبا گر ادھر آجاتی ہے

دل کے نالوں کی مفصل خبر آجاتی ہے

کیا جانئے کہ شمع سے کیا صبح کہہ گئی

اک آہ کھینچ کر جو وہ خاموش رہ گئی

کوئی نہیں کہ یار کی لادے خبر مجھے

اے سیل اشک تو ہی بہادے ادھر مجھے

کس سے اب بات کریں اور نہیں ہم کس سے

مر گیا دل ہی وہ اپنا کہ خوشی تھی جس سے

ہوا کچھ نہ خطرہ ہمیں مثل سایہ اگرچہ بلندی و پستی سے گزرے

مر جائیں قفس میں یونہی ہم آہ تڑپ کر

اتنی جو خبر لینے کو صیاد نہ ہووے

یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے کیا جانئے اُس سے کب ملیں گے

نظیر اکبرآبادی

ان کا نام ولی محمد تھا۔ اور نظیر تخلص۔ باپ کا نام محمد فاروق تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ نظیر بھی شہر دہلی ہی میں پیدا ہوئے۔ محمد شاہ ثانی کا عہد حکومت تھا۔ پیدائش کا سنہ اس زمانے کے لگ بھگ ہے۔ جب نادر شاہ دہلی پر حملہ آور ہوا تھا۔ بارہ اولادوں میں سے صرف یہی ایک زندہ بچے تھے۔ اس لئے ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھے۔

جس زمانے میں احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ نظیر اپنی ماں اور نانی کو ساتھ لے کر دہلی سے رخصت ہوئے۔ اور آگرے جا کر آباد ہو گئے۔ آگرہ اس زمانے میں

اکبرآباد کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ چونکہ نظیر نے ایک مرتبہ یہاں آجانے کے بعد پھر کبھی وطن کا رُخ نہ کیا۔ جوانی اور بڑھاپا یہیں گزار دیا۔ اس لیے وہ دہلوی ہوتے ہوئے بھی اکبرآبادی ہی کہلاتے ہیں ❖

آگرے میں تاج محل کے قریب ایک محلہ تاج گنج ہے وہاں نظیر نے مکان لے کر رہنا سہنا شروع کر دیا۔ شادی کی۔ جس سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی + طبیعت میں قناعت اتنی تھی۔ کہ کئی رئیسوں نے معقول تنخواہ پر اپنے ہاں بلانا چاہا۔ مگر انہوں نے ہمیشہ انکار کیا۔ آگرے میں ایک صاحب بلاسی رام تھے۔ بس ایک ان کے لڑکے کو پڑھا دیتے تھے۔ سترہ روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اسی پر صبر شکر سے گزارہ کر لیتے تھے ❖

ضعیفی میں ان پر فالج گرا۔ اور اسی مرض سے ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء کو انتقال ہوا ❖

نظیر بہت حلیم الطبع۔ ملنسار اور مروت والے بزرگ تھے کسی طرح کا تعصب یا خودبینی ان کے مزاج میں نہ تھی سیدھی سادی درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور ہر ایک سے

بے حد اخلاق اور دلچسپی سے ملتے تھے۔ دوسرے شعرا کی طرح ان کے مزاج میں ایسی خلوت پسندی اور تمکنت نہ تھی۔ کہ گھر کی تنہائی میں بیٹھے۔ فکر شعر کیا کریں۔ صرف چند اہل ذوق حضرات سے میل ملاقات روا رکھیں۔ اور کبھی کبھی مشاعروں میں جا کر اپنا کلام سنا آیا کریں۔

نظیر کا دائرہ ملاقات بہت وسیع تھا۔ امیر غریب سب سے تعلقات تھے۔ ادنیٰ اعلیٰ سب ان کے ہاں آتے۔ فقیر ان سے مناقبیں۔ قلندر حمدائیں اور خوانچے والے لٹکے کہوا کر لے جایا کرتے۔ بچے راستے میں پکڑ لیا کرتے اور اپنے لئے بیت کہلوا لیتے۔ ہندو مسلمان میں کسی قسم کا امتیاز نہ کرتے تھے۔ دونوں کے تہواروں میں شریک ہوتے دونوں کے میلوں ٹھیلوں اور کھیل تماشوں میں آتے جاتے چنانچہ دونوں مذاہب کے لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اور ان کے انتقال پر مسلمانوں کے علاوہ ہزارہا ہندو بھی جنازے میں شریک تھے۔

نظیر فارسی زبان کے عالم تھے۔ عربی کی قابلیت معمولی تھی۔ ہندوستان کے دوسرے کئی صوبوں کی بولیاں

مثلاً ہندی - پنجابی - مارواڑی اور پوربی خوب جانتے تھے -
مختلف مروجہ علوم و فنون میں بھی ان کی معلومات غیر معمولی طور
پر وسیع تھیں - کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے - کہ رمل
نجوم - ہندسہ - موسیقی - منطق وغیرہ سے بھی شغف تھا - اپنے
ملک کی سیاسیات کو بخوبی سمجھتے تھے - اور تاریخ سے غیر معمولی
دلچسپی رکھتے تھے ؎

نظیر کا کلام کئی لحاظ سے اردو کے دوسرے شعرا سے بہت
مختلف معلوم ہوتا ہے + اردو کے تقریباً تمام شاعروں نے غزل
کے میدان میں اپنی طبع رسا اور نازک خیالی کے جوہر دکھائے
ہیں + غزل کے علاوہ اگر کچھ کہا ہے - تو زیادہ تر قصیدے -
مرثئے - یا مثنوی کے انداز میں کچھ عاشقانہ داستانیں لکھی ہیں
لیکن نظیر کے کلام کو دیکھئے - تو اس کی دنیا ان سب سے
مختلف اور انوکھی نظر آتی ہے + وہ خیالی دنیا سے آسمان
کے تارے توڑ کر نہیں لاتے - نہ جذبات کے اتھاہ سمندر
میں سے موتی نکالتے ہیں - وہ جس ملک اور جن حالات میں
رہتے ہیں - اور جو کچھ اپنے اردگرد دیکھتے ہیں - ان میں سے
ہر ایسی چیز کو جو انہیں متاثر کرتی ہے - بیان کرتے ہیں ؎

نظیر ہندوستانی معاشرت کے بہت بڑے ماہر ہیں
امیر غریب - ادنیٰ اعلیٰ ہندو مسلمان سب کی معاشرت کو
وہ خوب سمجھتے ہیں - ان کے مشاغل اور تفریحوں سے بخوبی
واقف ہیں - ان کے رسم و رواج - تہواروں میلوں ٹھیلوں
اور خانگی زندگی کی ایک ایک تفصیل کو جانتے ہیں + کہیں
ہندوستان کی رُتوں کا اور یہاں کے دریاؤں پہاڑوں -
پھل پھولوں اور عمارتوں کا حال لطف لے لے کر بیان
کرتے ہیں - کہیں ہندوستان کے بزرگوں اور دیبوں اور
اوتاروں کی عظمت دل پر نقش کر دیتے ہیں + انہیں صرف
بنی نوع انسان ہی سے الفت نہیں - بلکہ جانوروں اور
بے جان چیزوں سے بھی محبت ہے - ان چیزوں سے
ان کی الفت معصوم بچوں کی مانند ہے - ان کی نظمیں بلبلوں
کی لڑائی - گلہری کا بچہ - ریچھ کا بچہ - کبوتر بازی - پتنگ
بازی سب اسی قسم کی ہیں - انہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے
جیسے وہ خود بھی بچے بن کر ان چیزوں میں بے حد خوشی سے
دلچسپی لے رہے ہیں +
نظیر نے نہ کبھی قصیدہ لکھا - نہ کسی کی ہجو کہی - وہ

ان چیزوں سے بلند تھے - دنیا کی ناپائیداری اور بے حقیقتی پر البتہ نہایت موثر اور پُرزور نظمیں کہی ہیں - ان کی نظمیں فنا نامہ - بنجارہ نامہ اور موت نامہ نہایت مؤثر اور سبق آموز ہیں - اور فقیروں اور درویشوں اور تارک الدنیا لوگوں کو عام طور سے از بر ہیں ؂

تمام کلام میں نظیر کا نقطۂ نظر خاص ہندوستانی ہے ان کے کلام میں تشبیہیں اور استعارے بھی ہندوستان ہی کے ہیں - دوسرے شعرا کی طرح وہ گل وبلبل کے افسانے اور اسکندر وجم کی شوکت اور عجم وعرب کے تجمل کی غیر ملکی داستانیں بیان نہیں کرتے - انہیں پپیہے کی پی کہاں - رابیل اور چمیلی کی نکہت - اکبر کی عالمگیری اور چتوڑ گڑھ اور کالنجر کی ملکی عظمت زیادہ متوجہ کرتی ہے - ان کا تجربہ اتنا وسیع ہے اور ان کی واقفیت اور ہمہ دانی کا یہ عالم ہے کہ معمولی سے معمولی موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں - تو اس میں تفصیل سے ایسا رنگ بھر دیتے ہیں - کہ اس میں بے حد دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے ؂

نظیر کے کلام میں بناوٹ اور تکلف مطلق نہیں - وہ

صنائع بدائع سے بے حد پرہیز کرتے ہیں۔ ان کی سادگی اور بے تکلفی ہی ان کے کلام کی جان ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بے شمار ہے۔ جس میں سے وہ حسب ضرورت جیسا لفظ چاہتے ہیں۔ موقع موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ غزل گو شعرا عام طور پر مستند اور سمجھے ہوئے الفاظ استعمال کیا کرتے تھے اور عام بازاری گفتگو کے الفاظ اپنے کلام میں مطلق نہ آنے دیتے تھے۔ لیکن نظیر نے پہلی مرتبہ مناسب موقعوں پر بلا تکلف وہ الفاظ شاعری میں استعمال کئے۔ جو ادنےٰ خیال کئے جاتے تھے۔ اور جنہیں لکھنا فصحا کے نزدیک باعث عار تھا۔ نظیر فقیروں اور عورتوں اور بازاری لوگوں وغیرہ کی زبان کے بڑے ماہر تھے۔ جس نظم کا تعلق جس طبقے اور درجے اور صنف سے ہوتا۔ اس میں مناسب مواقع پر اسی کا مخصوص انداز بیان اور اسی کے خاص الفاظ لکھا کرتے تھے۔ اس طرح انہوں نے اردو شاعری کو بہت سے ایسے الفاظ سے روشناس کرا دیا۔ جو متروک اور ناقابل اعتنا سمجھے جاتے تھے۔ اپنی اسی جدت اور واقعہ پسندی کے باعث وہ جاہل بھی مشہور ہو گئے ہیں۔ واقعہ

یہ ہے۔ کہ نظیر کو الفاظ کی بڑی سمجھ تھی۔ وہ ان کی اصوات کے اثرات میں امتیاز کر سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی کلیات میں جگہ جگہ اس کا ثبوت ملتا ہے۔ نظم میں ہنگامہ بیانی کریں گے۔ تو ایسے الفاظ لائیں گے۔ کہ ان سے بے چینی اور بے قراری ترشح ہو رہی ہوگی۔ بزم کا ذکر کریں گے۔ تو لفظوں سے بھی رنگینی ٹپک رہی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں۔ کہ نظیر میں نہ سودا کا زور ہے۔ نہ میر کی بلند پروازی۔ نہ انشا کی ظرافت اور نہ انیس و دبیر کا جوش و خروش تاہم یہ تمام خوبیاں اس میں ایک حد تک ضرور پائی جاتی ہیں۔ اور بقول مصنف تاریخ ادب اردو "اپنے تنوع مضامین۔ اپنی ناصحانہ روش۔ اپنی وسیع النظری۔ اپنی ہر طبقہ کے ساتھ دلچسپی اپنی خالص ہندوستانیت اور علی الخصوص ایک جدید رنگ کی ایجاد کے سبب سے نظیر پوری طرح اس کا مستحق ہے۔ کہ اس کو شعرائے اردو کی محفل میں ایک ممتاز جگہ دی جائے"۔

نظیر کا کلام بہت کچھ ضائع ہو گیا ہے۔ وہ عام طور سے لوگوں کی فرمائش پر انہیں نظمیں لکھ لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔ جن کے متعلق انہیں اتنا بھی یاد نہ رہتا تھا۔ کہ انہوں نے لکھی تھیں

کہتے ہیں۔ انہوں نے دو لاکھ سے زیادہ شعر کہے تھے۔ جن کا بیشتر حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ اب جس قدر کلام موجود ہے۔ وہ مقدار میں چھ ہزار شعر سے زیادہ نہیں۔ اور لالہ بلاس رام کی کاپیوں سے نقل کر کے لیا گیا ہے۔ ذیل میں نظیر کے کلام میں سے انتخاب درج کیا جاتا ہے ؛

برسات کی بہاریں

ہیں اس ہوا میں کیا کیا برسات کی بہاریں
سبزوں کی لہلہاہٹ باغات کی بہاریں
بوندوں کی جھمجھاہٹ قطرات کی بہاریں
ہر بات کے تماشے ہر گھات کی بہاریں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل ہوا کے اوپر ہو مست چھا رہے ہیں
جھڑیوں کی مستیوں سے دھومیں مچا رہے ہیں
پڑتے ہیں پانی ہر جا جل تھل بنا رہے ہیں
گلزار بھیگتے ہیں سبزے نہا رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جنگل سب اپنے تن پر ہریال سج رہے ہیں
گل پھول جھاڑ بوٹے کر اپنی دھج رہے ہیں
بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہے ہیں
اللہ کے نقارے نوبت کے بج رہے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

بادل لگا ٹکوریں نوبت کی گت لگاویں
جھینگر جھنگار اپنی سرنائیاں بجاویں
کر شور مور بگلے جھڑیوں کا مینہ بلاویں
پی پی کریں پپیہے مینڈک ملہار گاویں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہر جا بچھا رہا ہے سبزہ ہرے بچھونے
قدرت کے بچھ رہے ہیں ہر جا ہرے بچھونے
جنگلوں میں ہو رہے ہیں پیدا ہرے بچھونے
بچھوا دیے ہیں حق نے کیا کیا ہرے بچھونے
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

سبزوں کی لہلہاہٹ کچھ ابر کی سیاہی
اور چھا رہی گھٹائیں سرخ اور سفید کاہی

سب بھیگتے ہیں گھر گھر لے ماہ "تا" بماہی
یہ رنگ کون رنگے تیرے سوا الٰہی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
بولیں بیئے بٹیریں قمری پکارے کو کو
پی پی کرے پپیہا بگلے پکاریں تو تو
کیا ہدہدوں کی حق حق کیا فاختوں کی ہو ہو
سب رٹ رہے ہیں تجھ کو کیا پنکھ کیا پنکھیرو
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
جو مست ہوں ادھر کے کر شور ناچتے ہیں
پیارے کا نام لے کر کیا زور ناچتے ہیں
بادل ہوا سے گھر گھر گھنگھور ناچتے ہیں
مینڈک اچھل رہے ہیں اور مور ناچتے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں
چھت گرنے کا کسی جا غل شور ہو رہا ہے
دیوار کا بھی دھڑکا کچھ ہوش کھو رہا ہے
ڈر ڈر حویلی والا ہر آن رو رہا ہے
مفلس تو جھونپڑے میں دلشاد سو رہا ہے

کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

مدت سے ہو رہا ہے جن کا مکاں پرانا
اٹھ کے ہے ان کو ہینہ میں ہر آن چھت پہ جانا
کوئی پکارتا ہے ٹک موری کھول آنا
کوئی کہے ہے چل بھی کیوں ہو گیا دوانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

جو اس ہوا میں یارو دولت میں کچھ بڑے ہیں
ہے ان کے سر پہ چھتری ہاتھی اوپر چڑھے ہیں
ہم سے غریب غربا کیچڑ میں گر پڑے ہیں
ہاتھوں میں جوتیاں ہیں اور پائنچے چڑھے ہیں
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

ہے جن کنے مہیّا پکا پکایا کھانا
ان کو پلنگ پہ بیٹھے جھڑیوں کا حظ اٹھانا
ہے جن کو اپنے گھر میں یاں نون تیل لانا
ہے سر پہ ان کے پنکھا یا چھاج ہے پرانا
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

کیچڑ سے ہو رہی ہے جس جا زمین پھسلنی

مشکل ہوئی ہے واں سے ہر اک کو راہ چلنی
پھسلا جو پاؤں پگڑی مشکل ہے پھر سنبھلنی
جوتی گری تو واں سے کیا تاب پھر نکلنی
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

گر کر کسی کے کپڑے دلدل میں ہیں معطر
پھسلا کوئی کسی کا کیچڑ میں منہ گیا بھر
اک دو نہیں پھسلتے کچھ اس میں آن اکثر
ہوتے ہیں سینکڑوں کے سر نیچے پاؤں اوپر
کیا کیا مچی ہیں یارو برسات کی بہاریں

چلنے کی فکر کرو بابا

بٹ مار اجل کا آ پہنچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اٹھا اس جینے سے بے بس من مار مرو بابا
جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

دو چار گھڑی یا دو دن میں اب تن سے جان نکلنی ہے،
یہ ہڈی پسلی جتنی ہے یا گلنی ہے یا سڑنی ہے
ہے رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں یہ بھی ڈھلنی ہے،
اٹھو باندھو کمر کو سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

کچھ دیر نہیں اب چلنے میں کیا آج چلو یا کل نکلو
کچھ کپڑا لتا لینا ہو سو جلدی باندھ سنبھل نکلو
اب شام نہیں اب صبح ہوئی جوں موم پگھل کر ڈھل نکلو
کیوں ناحق دھوپ چڑھاتے ہو بس ٹھنڈے ٹھنڈے چل نکلو
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ اونٹ کراہے کا یارو صندوق جنازہ ارتھی ہے
جب اس پہ ہوا اسوار چلے پھر گھوڑا ہے نہ عماری ہے،
کس نیند پڑے تم سوتے ہو یہ بوجھ تمہارا بھاری ہے،
کچھ دیر نہیں اب آہ نظیر تیار کھڑی اسواری ہے،
تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا

اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

ریچھ کا بچّہ

تھا ہاتھ میں اک اپنے سوا من کا جو سونٹا
لوہے کے کڑے جن پر کھڑکتے تھے سراپا
کاندھے پہ چڑھا جھولنا اور ہاتھ میں پیالا
بازار میں لے آئے دکھانے کو تماشا
آگے تو ہم اور پیچھے وہ تھا ریچھ کا بچّا

تھا ریچھ کے بچے پہ وہ گہنا جو سراسر
ہاتھوں میں کڑے سونے کے بجتے تھے جھمک کر
کانوں میں دُرا اور گھنگرو پڑے پاؤں کے اندر
وہ ڈور بھی ریشم کی بنائی تھی جو پر زر
جس ڈور سے یارو تھا بندھا ریچھ کا بچّا

مدت میں اب اس بچہ کو ہم نے ہے سدھایا
لڑنے کے سوا ناچ بھی ہے اس کو سکھایا
یہ کہہ کے جو ڈھپلی کے تئیں گت بجایا
اس ڈھب سے اسے چوک کے جمگھٹ میں نچایا

جو سب کی نگاہوں میں کھبا ریچھ کا بچّا

پھر ناچ کے وہ راگ بھی گایا تو وہاں واہ
پھر کہروا ناچا تو ہر اک بولی زباں واہ
ہر چار طرف سنئے کہیں پیر و جواں واہ
سب ہنس کے یہ کہتے تھے میاں واہ میاں واہ
کیا ہم نے دیا خوب نچا ریچھ کا بچّا

جب ہم نے اٹھا ہاتھ کڑوں کو جو ہلایا
خم ٹھونک پہلواں کی طرح سامنے آیا
لپٹا تو یہ کشتی کا ہنر آن دکھایا
جو چھوٹے بڑے جتنے تھے ان سب کو رجھایا
ہم بھی نہ تھکے اور نہ تھکا ریچھ کا بچّا

جب کشتی کی ٹھہری تو وہیں سر کو جو جھاڑا
للکارتے ہی اس نے ہمیں آن لتاڑا
گہ ہم نے پچھاڑا اسے گہ اس نے پچھاڑا
اک ڈیڑھ پہر ہو گیا کشتی کا اکھاڑا
پر ہم بھی نہ ہارے نہ ہٹا ریچھ کا بچّا

ہولی

آ جھمکے عیش و طرب کیا کیا جب حسن دکھایا ہولی نے
ہر آن خوشی کی دھوم ہوئی یوں لطف جتایا ہولی نے
ہر خاطر کو خورسند کیا ہر دل کو لبھایا ہولی نے
دف رنگیں نقش سنہری کا جس وقت بجایا ہولی نے
بازار گلی اور کوچوں میں غل شور مچایا ہولی نے

کچھ طبلے کھٹکے تال بجے کچھ ڈھولک اور مردنگ بجی
کچھ جھڑپیں بینوں ربابوں کی کچھ سارنگ اور چنگ بجی
کچھ تار طنبوروں کے جھنکے کچھ ڈھمڈھی اور منہ چنگ بجی
کچھ گھنگھرو کھٹکے جھم جھم جھم کچھ گت گت پر آہنگ بجی
ہے ہر دم ناچنے گانے کا یہ تار بندھایا ہولی نے

ہر جا گئے تھال گلالوں سے خوش رنگت کی گلکاری ہے
اور ڈھیر عبیروں کے لاگے سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے اور رنگ بھری پچکاری ہے
منہ سرخی سے گلنار ہوئے تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ روپ جھمکتا دکھلایا یہ رنگ دکھایا ہولی نے

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ آگ اور رنگ جھمکتے ہیں کچھ لے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودیں کچھ اچھلیں ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

کلجگ

دنیا عجب بازار ہے کچھ جنس یاں کی سات لے
نیکی کا بدلہ نیک ہے بد سے بدی کی بات لے
میوہ کھلا میوہ ملے پھل پھول دے پھل پات لے
آرام دے آرام لے دکھ درد سے آفات لے
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
جو چاہے لے چل اس گھڑی سب جنس یاں تیار ہے
آرام میں آرام ہے آزار میں آزار ہے
دنیا نہ جان اس کو میاں دریا کی یہ منجدھار ہے
اوروں کا بیڑا پار کر تیرا بھی بیڑا پار ہے

کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

اپنے نفع کے واسطے مت اور کا نقصان کر
تیرا بھی نقصان ہووے گا اس بات پر تو دھیان کر
کھانا جو کھا تو دیکھ کر پانی پیئے تو چھان کر
یاں پاؤں کو رکھ پھونک کر اور خوف سے گزران کر
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

غفلت کی یہ جاگہ نہیں یاں صاحب ادراک رہ
دلشاد رکھ دلشاد رہ غمناک رکھ غمناک رہ
ہر حال میں تو بھی نظیر اب ہر قدم کی خاک رہ
یہ وہ مکاں ہے او میاں یاں پاک رکھ بیباک رہ
کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ یاں دن کو دے اور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

جب لاد چلے گا بنجارا

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئیں اور پلا بھارا
کیا گیہوں چاول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
کیا سود بڑھا کر لادے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گرا دے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا۔ اک کنبہ کام نہ آویگا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاویگی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے پاویگی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاویگی
دھی پوتا جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آویگی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے

کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

خدا کی باتیں خدا ہی جانے

جہاں میں کیا کیا خرد کے اپنے ہر اک بجاتا ہے شادیانے
کوئی حکیم اور کوئی مہندس کوئی ہو پنڈت کتھا بکھانے
کوئی ہے عاقل کوئی ہے فاضل کوئی نجومی لگا کہانے
جو چاہو کوئی یہ بھید کھولے یہ سب ہیں جعلی یہ سب بہانے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت کروڑوں دانا ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے
زمیں سے لیکر جو آسماں تک بھری ہے لاکھوں طرح کی خلقت
کہیں ہے ہاتھی کہیں ہے چیونٹی کہیں ہے رائی کہیں ہے پربت
یہ جتنے جلوے دکھا رہی ہے خدا کی صنعت خدا کی حکمت
جو چاہے کھولے یہ بھید اس کے کسی کو اتنی نہیں ہے قدرت
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت کروڑوں دانا ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے
کوئی ہے ہنستا کوئی ہے روتا کہیں ہے شادی کہیں غمی ہے

کہیں ترقی کہیں تنزل کہیں گماں اور کہیں یقین ہے
کوئی گھستا زمیں کے اوپر کوئی خوشی سے فلک نشیں ہے
یہ بھید اپنا وہ آپ جانے کسی کو اس کی خبر نہیں ہے
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت کروڑوں انا ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

عجب یہ شطرنج کا سا نقشہ بچھا ہے دن اور رات اس جا
جو بات چاہے کرے کسی کو نہ آوے نزد اس کو ہات اس جا
ہزاروں منصوبے باندھ دل میں بناوے چاہو نیکی گھات اس جا
نہیں ہے اک چار چوک قائم سبھوں کی بازی ہے مات اس جا
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت کروڑوں انا ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

یہ کون جانے کہ کل کیا کیا اور آج مالک وہ کیا کرے گا
کسے بگاڑے کسے سنوارے کسی لنڈاوے کسے بھریگا
کسی کے گھر کون ہووے پیدا کسی کے گھر کون سا مریگا
کسی کو ہرگز خبر نہیں ہے کہ کیا کیا اور کیا کرے گا
پڑے بھٹکتے ہیں لاکھوں پنڈت کروڑوں انا ہزاروں سیانے
جو خوب دیکھا تو یار آخر خدا کی باتیں خدا ہی جانے

معصوم بھولے بھالے

کیا دن تھے یار وہ بھی تھے جبکہ بھولے بھالے
نکلے تھی دائی لے کر پھرتی کبھی دوا سے
چوٹی کوئی رکھالے بدھی کوئی پنہا سے
ہنسلی گلے میں ڈالے منت کوئی بڑھالے
موٹے ہوں یا کہ دُبلے گورے ہوں یا کہ کالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

دل میں کسی کے ہرگز نے شرم و نے حیا ہے
آگا بھی کھل رہا ہے پیچھا بھی کھل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے ننگے پھرے تو کیا ہے
یاں یوں بھی واہ وا ہے اور ووں بھی واہ وا ہے
کچھ کھالے اس طرح سے کچھ اس طرح سے کھالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

مرجائے کوئی تو بھی کچھ ان کو غم نہ کرنا
نے جانیں کچھ بگڑنا نے جانے کچھ سنورنا
ان کی بلا سے گھر میں ہو قند یا شکر نا

جس بات پر یہ مچلے بس وہ ہی کر گزرنا
ماں اوڑھنی کو بابا پگڑی کو بیچ ڈالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جوان کو دو سو کھالیں پھیکا ہو یا سلونا
ہیں بادشاہ سے بڑھکر جب مل گیا کھلونا
جس جا پہ نیند آئی پھر واں ہی ان کو سونا
پرواہ نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیے بچھونا
بھونپو کوئی بجالے پھرکی کوئی پھرالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

یہ بالے پن کا یارو عالم عجب بنا ہے
یہ عمر وہ ہے اس میں جو ہے سو بادشاہ ہے
اور سچ اگر جو پوچھو تو بادشاہ کیا ہے
اب تو نظیرؔ میری سب کو یہی دعا ہے
جیتے رہیں سبھی کے آس و مراد والے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جُرأت

قلندر بخش جرأت - اصل میں دلی کے رہنے والے تھے - اکبر آبادی مشہور ہوئے - ان کا اصلی نام یحییٰ امان تھا - ان کے بزرگ بادشاہی دربار میں دربانی کیا کرتے تھے - اور لوگوں کی طرح ان کا خاندان بھی فیض آباد میں آبسا تھا - انہوں نے یہیں تعلیم و تربیت پائی - ابھی جوان نہ ہونے پائے تھے کہ اندھے ہوگئے *

طبیعت چلبلی پائی تھی - گانے بجانے کے بڑے شوقین تھے - ستار خوب بجاتے تھے - شاعری کا شوق ہوا تو جعفر علی حسرت کے شاگرد ہوگئے *

میاں جرأت ۱۲۱۵ھ میں دہلی سے لکھنؤ پہنچے - اور مرزا سلیماں شکوہ کے یہاں ملازم ہوگئے + یہاں ان سے اور انشا و جرأت سے اکثر صحبتیں رہا کرتی تھیں +

ان کے تین دیوان ہیں - اس میں ہر طرح کی غزلیں رباعیاں - مخمس - مستزاد - واسوخت - ہجویں اور زنا ریختیں ہیں +

آخر عمر تک لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۲۲۵ھ میں انتقال کیا - ناسخ نے تاریخ کہی - ع

ہائے ہندوستان کا شاعر مُوا

میاں جرأت غزل میر تقی میر کے رنگ میں کہتے تھے میر کی فصاحت اور سادگی پر انہوں نے اپنی شوخی اور بانکپن کو اور بڑھا دیا تھا - جس سے ان کی غزلوں کو عام لوگ بہت پسند کرتے تھے + ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام کی دھوم مچ گئی - ان کی خاص طرز انہیں کی ایجاد ہے +

جرأت کی زندہ دلی اور ہر دلعزیزی کے لطیفے اکثر لوگوں کی زبانوں پر ہیں +

کریلا ایک بھانڈ دلی کا رہنے والا نواب شجاع الدولہ
کے ساتھ گیا تھا۔ اور اپنے فن میں بڑا کمال رکھتا تھا +
ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ جرأت بھی
وہاں موجود تھے۔ اس نے نقل کی + ایک ہاتھ میں لکڑی
لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر
پھرنے لگا اور کہنے لگا "حضور! شاعر بھی اندھا۔ شعر بھی
اندھا۔ مضمون بھی اندھا ؎

صنم سنتے ہیں تیری بھی کمر ہے۔
کہاں ہے۔ کس طرف کو ہے۔ کدھر ہے۔

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے۔ ادھر گھر آکر انہوں نے
بھی ہجو کہہ ڈالی + کریلا یہ سن کر بہت بھنّایا + دوسرے دن
میں پھر اندھے کی نقل کی۔ اسی طرح ایک لاٹھی لے کر
پھرنے لگا۔ ان کی غزل ہے ؎

امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ
کیا رات ہے۔ کیا رات ہے۔ کیا رات ہے واللہ

ہر رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔ اس
غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرعہ ایک ہی ڈھنگ پر ہے۔

چنانچہ ساری غزل کو اسی طرح محفل میں پڑھتا رہا + شیخ صاحب اور بھی غضبناک ہوئے اور پھر ایک ہجو کہی ترجیع بند تھا ع

اگلا جھولے بگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے

اس کو بھی خبر ہوئی - بہت جلا بھنا + پھر کسی محفل میں ایک زچہ کا سوانگ بھرا اور ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھتنا گھس گیا ہے + خود ملا بن کر بیٹھا اور جس طرح جنات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے + اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا کہ ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے - جرأت ہے تو باہر نکل آ کہ ابھی جلا کر خاک کر دوں + آخر اب کی دفعہ انہوں نے ایسی خبر لی کہ کریلا کو معافی مانگنی پڑی +

ایک لطیفہ ہے کہ ایک دن میر انشاءاللہ خاں جرأت کی ملاقات کو آئے - دیکھا - تو سر جھکائے کچھ سوچ رہے ہیں + انہوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو + جرأت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے - چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے + انہوں نے پوچھا کیا ہے + جرأت نے

کہا کہ خوب مصرع ہے۔ مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہوگا اس وقت تک نہ سناؤں گا۔ نہیں تو تم مصرع لگا کر اسے بھی چھین لوگے۔ سید انشا نے بہت اصرار کیا۔ آخر جرأت نے مصرع پڑھ دیا ؏

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

سید انشا نے فوراً کہا ؏

اندھے کو اندھیرے میں بڑی دور کی سوجھی

جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اٹھا کر مارنے دوڑے + دیر تک سید انشا آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے +

کلام کا نمونہ :-

غزلیں

یہ جواب لے کے قاصد جو پھرا شتاب الٹا

میں زمیں پہ ہاتھ مارا بہ صد اضطراب الٹا

یہ وفا کی میں نے تس پر مجھے کہتے ہیں وفا ہو

میری بندگی ہے صاحب یہ ملا خطاب الٹا

مرے بخت ہیں وہ ردکش کہ وہ دے جو وعدہ شب
تو پہنچکے تا یہ مغرب پھرے آفتاب الٹا

وہ بہا کے کاسۂ سر مرے خوں میں شکل کشتی
کہے ہے کہ دیکھو نکلا یہ ہوا حباب الٹا

غزل اور پڑھ تو جرأت کہ گیا یہاں سے گھر تو
تو کلام سننے تیرا میں پھرا شتاب الٹا

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ میں آپ آئے ہوئے
کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

آپ سے میں تو نہ جاؤں پہ کروں کیا کہ وہیں
دل بیتاب لئے جائے ہے دوڑائے ہوئے

گھر میں بے یار ہے شکل اپنی یہ دل کے ہمراہ
دو گنہ گار ہوں جوں قید میں بٹھلائے ہوئے

آج بھی اس کے جو آنیکی نہ ٹھیری تو بس آہ
ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھیرائے ہوئے

پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا
آج لوگ اس کو لئے جاتے ہیں کفنائے ہوئے

مردنی پھر گئی منہ پہ مرے جن کی خاطر
رنگ رو کیا وہ پڑے پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

کر کے موزوں انہیں جرأت غزل اک اور بھی پڑھ
دل میں جو تازہ مضامیں ہوں ٹھہرائے ہوئے

متفرق اشعار

بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی
اور جو بولے بھی ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا

آئے جو مرے پاس تو منہ موڑ کے بیٹھے
یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

تجھ کو ہم اس لئے کہتے تھے کوئی دم مت جا
چل بسے ہم نہ ترے چلتے ہی چلتے دیکھا

اس کا بیمار نہ نکلا کبھی گھر سے جرأت
گھر سے تابوت ہی آخر کو نکلتے دیکھا

جستجو میں دل کے بہلانے کے جی کھونا پڑا
جو ہنسی کی بات تھی اس کا ہمیں رونا پڑا

تشبیہہ کس مزہ سے ہیں لذت کو اسکی دل

کچھ دل ہی جانتا ہے مرا دل کی چاہ کا
فصل گل گرچہ ہزار آئی پر اپنا جرأت۔

دل پژمردہ نہ جوں غنچۂ تصویر کھلا +
اور تو کیا مشغلے ہیں ہجر میں تیرے مگر

دل کی بیتابی سے سو سو بار اٹھنا بیٹھنا
ہم اسیران قفس کیا کہیں خاموش ہیں کیوں

راہ لگ اپنی چل اے باد صبا تجھ کو کیا
نزع میں بھی تری تصویر کو نہ دیکھا افسوس

مرتے مرتے بھی نہ ارمان نظر کا نکلا
خدا جانے کریگا چاک کس کس کے گریباں کو

ادا سے ان کا چلنے میں اٹھا لینا یہ داماں کو
چین ہو کیا خانۂ ہستی میں خاک

جو یہاں آیا مکدّر ہی گیا
گیا وہ دل ہی پہلو سے کہ جس کو

کبھی روتے تھے چھاتی سے لگا کر
دل ہی اس کافر کا پتھر ہو تو کوئی کیا کرے

ورنہ ایسی آہ سوزاں بے اثر میری نہیں

تو نے اس باغ میں دم بھرنے کی مہلت پائی
اے صبا ہم نے تو اتنی بھی نہ مہلت پائی

دور سے کل ہم نے اس کے آستاں کو دیکھ کر
رو دیا کن حسرتوں سے آسماں کو دیکھ کر

ہم اسیروں کو ملا ہے تنگ یاں ایسا قفس
زیر گردوں ٹک زمیں پر تلملا سکتے نہیں

جوش گل چاک قفس سے دمبدم دیکھا کئے
سب نے لوٹی ہیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے

ناسخ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ تخلص۔ خدا بخش ان کے باپ تھے۔ جو خیمے بنایا کرتے تھے + بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ خدا بخش نے ان کو اپنا بیٹا بنایا تھا + یہ فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں پرورش پائی + اس زمانہ کے رواج کے مطابق ورزش کرنے کو طبیعت چاہی تو اس میں لگ گئے۔ جس کی وجہ سے ان کا بدن بہت پھر تیلا ہوگیا تھا +

نواب محمد تقی فیض آباد کے ایک امیر تھے۔ انہیں بانکوں ترچھوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہوں نے شیخ

صاحب کو اپنے یہاں نوکر رکھ لیا اور اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔

بڑے بوڑھے لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے۔ انہوں نے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد یہ بہت بڑی دولت کے مالک ہو گئے۔ اور ٹکسال میں ایک مکان لے کر رہنے لگے۔ اس مکان کے سامنے گلی میں ایک مولوی صاحب کا گھر تھا۔ ان کا نام تھا مولوی وارث علی۔ یہ گھر پر لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ یہ بھی ان لڑکوں میں شامل ہو گئے جو کچھ پڑھتے روزانہ یاد کر لیتے۔ ہوتے ہوتے اچھی خاصی لیاقت ہو گئی۔ جو شاعری کی ضرورتوں کے لئے کافی تھی۔

شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں بنے۔ مگر بچپن سے شاعری کے عاشق تھے۔ چپکے چپکے شعر کہتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اول اول مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ کوئی مصحفی کے شاگرد عیسیٰ تنہا تھے۔ کہتے ہیں کہ ان سے تنہائی میں مشورہ کر لیتے تھے۔ جب اطمینان

ہوگیا۔ تو شاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے ۔

اس زمانہ میں مرزا حاجی ایک امیرزادہ تھے ۔ جو خود بھی پڑھے لکھے تھے ۔ ان کے یہاں مرزا قتیل۔ قاضی محمد صادق خاں اختر اور بہت سے باکمال لوگ جمع رہتے تھے ۔ ناسخ بھی ان کے دربار میں پہنچ گئے ۔ انہیں کی صحبت میں ان کو زبان کی تراش خراش اور تحقیق کا چسکا پڑا اور انہیں کے بڑھانے سے ان کا کلام روز بروز رنگ پکڑتا گیا ۔ اس کے علاوہ حاجی صاحب کے پاس بیٹھنے سے ان کی شخصیت بڑھ گئی ۔ بڑے بڑے سمجھدار لوگ ان کے پاس آنے لگے ۔ غرض کہ مرزا حاجی کے سبب سے ان کی شاعری خوب چمکی ۔

چند روز کے بعد نواب معتمد الدولہ کا دوبارہ عروج ہوا اور مرزا حاجی نظر بند کر دیئے گئے ۔ ناسخ بھی ان کی لپیٹ میں آ گئے اور ان کو بھی گھر میں بٹھا دیا گیا ۔ ایک دن ان کے بلانے کو ایک چوبدار آیا ۔ یہ سمجھے کہ رنگ بگڑا بہانہ کر کے بھاگے ۔ بڑی مشکلوں سے میر اسد علی خاں کے یہاں جا کر چھپے ۔ انہوں نے پھر نواب سے اور ان سے

صفائی کرادی اور آخرکار نواب نے سو روپلے ماہوار ان کے مقرر کر دیئے ✤

جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے۔ تو معتمد الدولہ کو ان کی جگہ سے ہٹا دیا گیا۔ اور میر فضل علی اعتماد الدولہ کے خطاب کے ساتھ وزیر بنائے گئے + جب ان سے کام نہ چلا تو حکیم مہدی بلائے گئے + حکیم مہدی کو شیخ صاحب یاد آئے چوبدار بلانے آیا۔ اس وقت بھی یہ بہانہ کرکے بھاگے۔ اور چھپکے فقیر محمد خاں گویا کے یہاں پہنچے + وہاں سے میانہ میں بیٹھ کر بھاگے۔ کانپور ہوتے ہوئے الہ آباد پہنچے + وہاں کچھ دنوں رہ کر کانپور چلے آئے + اسی سلسلہ میں بنارس اور عظیم آباد بھی گئے + جب حکیم مہدی اپنی جگہ سے ہٹ کر فرخ آباد آئے تو یہ بھی خیریت سے گھر آئے ✤

چند دنوں بعد حکیم مہدی پھر وزیر ہوگئے۔ شیخ صاحب پھر بھاگ کر الہ آباد پہنچے۔ مگر تھے خوش قسمت کہ تھوڑے ہی دنوں بعد حکیم مہدی کی وفات پر سب باتوں کا خاتمہ ہو گیا اور اب کی دفعہ جو آئے تو مر کر بھی گھر سے نہ نکلے ✤

محمد علی شاہ نے سو روپے ماہوار گھر بیٹھے مقرر کر دیئے ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی اور ٹکسالی والے مکان میں دفن ہوئے ۔

ان کا رنگ کالا تھا ۔ موٹے تازے آدمی تھے ۔ بھاری آواز سے بولتے تھے ۔ طبیعت میں صفائی اور بناؤ زیادہ تھا ۔ مکان سجا ہوا رہتا تھا ۔ مونڈھے کرسیاں گھر میں بچھی رہتی تھیں ۔ دسترخوان پر اچھے اچھے کھانے آتے تھے ۔ ہمیشہ آٹھ دس آدمی ساتھ کھاتے تھے ۔ یہ بہت خوش اخلاق تھے ۔ مگر اپنے خیالات میں ایسے ڈوبے ہوئے رہتے تھے کہ بے جانے والا ان کو خشک مزاج اور بددماغ سمجھتا تھا ۔

ایک دن ایک صاحب ملنے آئے ۔ یہ اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ صحن میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ ان صاحب کے ہاتھ میں چھڑی تھی اور اتفاق سے پاؤں کے آگے ایک مٹی کا ڈھیلا پڑا ہوا تھا ۔ یہ اس ڈھیلے کو چھڑی سے آہستہ آہستہ توڑنے لگے ۔ ناسخ نے نوکر کو آواز دی ۔ وہ آیا تو اس سے کہا کہ میاں ایک ٹوکری مٹی

کے ڈھیلوں کی ان کے آگے رکھ دو کہ یہ جی بھر کر اپنا شوق پورا کریں +

اسی طرح ایک اور صاحب آکر بیٹھے - فرش پر ایک تنکا پڑا ہوا تھا - وہ اسے اٹھا کر کبھی موڑ لیے اور کبھی ذرا ذرا سا توڑنے لگتے + شیخ صاحب نے نوکر کو پکار کر کہا - "میاں بازار سے پانچ سات جھاڑویں تو لے آؤ" اس نے تھوڑی دیر بعد آکر کہا "حضور! بنیئے نے کہا ہے کہ ۳ جھاڑویں ہیں - باقی پھر آجائیں گی" - فرمایا "اچھا ایک جھاڑو ان کے سامنے لا کر رکھ دو - انہیں تنکے توڑنے کا بہت شوق ہے +

اگرچہ ان کے کلام اور حکایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں شوخی اور رنگینی نہ تھی - مگر شاعری کا وہ نشہ ہے کہ اپنے رنگ پر لے ہی آتا ہے + چنانچہ میر گھسیٹا نام ایک شخص مر گئے - تو تاریخ فرمائی ؎

جب میر گھسیٹا مر گئے ہائے — ہر ایک نے اپنے منہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سن کے تاریخ — افسوس کہ موت نے گھسیٹا

ان کے دو دیوان چھپ گئے ہیں - پہلے میں ان کا

خاص رنگ جھلکتا ہے + دوسرا دیوان الہ آباد کی کمائی ہے جس میں بیوطنی اور پریشانی کی ہر جگہ جھلک نظر آتی ہے اس وجہ سے اس کا نام " دفتر پریشاں رکھا تھا۔

ان دیوانوں میں غزلیں - رباعیاں - قطعے اور تاریخیں ہیں + قصیدے نہیں کہے - اگر شاہان اودھ کی تاریخ یا تہنیت میں کبھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی ہے - تو غزلوں اور قطعوں میں اس فرض کو ادا کیا ہے +

ایک مثنوی " حدیث مفصل" کے ترجمہ میں ہے - اور ایک مولود شریف ہے - یہ دونوں نظمیں ان کے منہ پر نہیں کھلتیں +

غزلوں میں بہت بلند اور نازک مضامین کہتے ہیں الفاظ بڑے شان کے لاتے ہیں + ان کے کلام میں تاثیر کم ہے + تشبیہہ اور تمثیل میں ایسی دستکاری کرتے ہیں کہ بعض موقع پر شعر بہت بے لطف ہو جاتا ہے + دُون کی زیادہ لیتے ہیں - مبالغہ میں اتنا زور مارتے ہیں - کہ اصلیت بالکل غائب ہی ہو جاتی ہے + کہیں شعر کی تمام عمارت کی بنیاد صرف لفظی مناسبت پر ہوتی ہے - کہیں

فرضی تشبیہوں اور استعاروں سے شعر کو گرانبار کر دیتے ہیں۔ کہیں کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہہ دے کر اس کی تمام لازمی چیزوں کو اس کے لئے ثابت کرتے ہیں حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ ان کا کلام فن کی غلطیوں سے پاک ہے لیکن نہایت روکھا پھیکا اور بے مزہ" ؛

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

غزلیں

میرا سینہ ہے مشرق آفتاب داغ ہجراں کا
طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا

شگفتہ مثل گل ہر فصل گل میں داغ ہوتے ہیں
بنا ہے کیا ہمارا کالبد خاک گلستاں کا

سیہ خانہ مرا روشن ہوا ویران ہونے سے
کیا دیوار کے رخنوں نے یاں عالم چراغاں کا

وہ شوخ فتنہ انگیز اپنی نظروں میں سمایا ہے
کہ اک گوشہ ہے صحرائے قیامت جس کے داماں کا

مرا ویرانہ مثل آئینہ معمور حیرت ہے
یقیں ہر رخنۂ دیوار پر ہے چشم حیراں کا
نہ شمشیر قاتل کس قدر بشاش تھا ناسخ
کہ عالم ہر دہاں زخم پر تھا روے خنداں کا

ان لبوں کی یاد میں داغ دل دیوانہ ہے
آتشِ یاقوت سے روشن چراغِ خانہ ہے
پھر بہار آئی کف ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش میں جلوۂ باد صبا مستانہ ہے
ہر بگولے میں عیاں اک لغزش مستانہ ہے
گردش چشم غزالاں گردش پیمانہ ہے
ہے بساں شمع روشن ہر چراغ چشم غول
ہو چکا ہے بارہا آباد جو ویرانہ ہے
سرخوشی ممکن نہیں جب تک نہ چھلکے جام عمر
یہ خرابات جہاں بھی روزی میخانہ ہے
دیکھتے تھے کل جنہیں آنکھوں سے ہم اے غافلو
آج ان کا اپنے کانوں کے لئے افسانہ ہے

محو ایسے خانۂ رنگیں میں مہماں ہو گئے۔
یہ نہیں ثابت کسی پر کون صاحب خانہ ہے

نال گرتا ہے کبھی اور لاش گرتی ہے کبھی
جوزچہ خانہ ہے وہ اک روزماتم خانہ ہے

شہر دم میں ہوتے ہیں آباد جن کے حکم سے
ایک دن ان کے لئے بھی گوشۂ ویرانہ ہے

آج ہے جس کے قدم سے رونق باغ جہاں
کل وہی رخصت برنگ سبزۂ بیگانہ ہے

اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو
اس کی باتوں پر نہ جاؤ ناسخ اک دیوانہ ہے

روئے جاناں کا تصور میں جو نظارہ ہُوا
دل میں تھا جو داغ حسرت عرش کا تارا ہوا

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا
سر پہ ہر محبوب کے خط مانگ کا آرا ہُوا

گرم ہے کیا عکس تیرے رائے آتشناک کا
آئینہ کی پشت کا معدوم سب پارا ہُوا

رات غائب ہو گئی ظاہر ہوئے آثار صبح
وصل میں خورشید گویا شام کا تارا ہوا

شب ہوا سے ہل گئی جو اس کی زلف عنبریں
دم میں موم شمع سارا عنبر سارا ہوا

قد ترا سرد آنکھیں نرگس زلف سنبل رخ ہے گل
کون ہے یکمشت گل میں جو چمن آرا ہوا

جوش وحشت تیری آنکھوں پر یہ خوش چشموں کے ہے
مثل آہو دشت میں ہر اک آوارہ ہوا

ہو گئی ہے شمع تیرے سامنے خجلت سے آب
شمعداں گویا تری محفل میں فوارہ ہوا

چین سے سویا نہ دنیا میں کبھی جز خواب مرگ
بعد مرنے کے جنازہ مجھ کو گہوارہ ہوا

پیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے یہ زاہد ملا
پیٹھ پر بار گنہ کا جمع پشتارا ہوا

دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو
قتل آج اس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

متفرق اشعار

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں
دل دکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خار کا

خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں
سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

او محتسب سمجھ کے تو شیشہ کو توڑیو
دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا

دم اخیر تو کرلوں نظارہ جی بھر کے
الٰہی خنجر سفاک آبدار نہ ہو

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو
ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

داغ فرقت زیست بھر سوز جہنم بعد مرگ
ان بتوں کو کس توقع پر خدایا چاہیے

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے

کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

کیا برستی ہے بجائے ابر رحمت بیکسی

ہے یہی تربت مقرر ناسخ مغفور کی

مصحفی

شیخ غلام ہمدانی نام تھا اور مصحفی تخلص کرتے تھے۔
باپ کا نام ولی محمد تھا۔ امروہہ کے رہنے والے تھے +
شروع جوانی میں دلی آئے اور مولوی مستقیم گویاموی
سے عربی صرف و نحو کی کتابیں پڑھیں۔ خدا نے طبیعت
موزوں عطا کی تھی۔ شعر کہنے کی طرف توجہ کی اور دلی کے
بڑے بڑے لوگوں کی صحبت میں آنے جانے لگے۔ تھوڑے
دنوں میں مشق بڑھ گئی۔ تو اپنے گھر پر مشاعرہ کرنے لگے
اور جب تک دلی میں رہے۔ شاعری کی دھن میں لگے
رہے +

جب دلی اجڑ گئی اور لوگوں کی طرح ان کو بھی دلی چھوڑنی پڑی۔ تو دلی سے نکل کر یہ پہلے ٹیکہ آئے۔ نواب محمد یار خاں کے یہاں سے تنخواہ مقرر ہوگئی اور نہایت اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے + جب نواب یار محمد خاں کا کھیل بگڑا۔ تو لکھنؤ چلے آئے۔ تھوڑے دنوں رہ کر پھر دلی چلے گئے۔ مگر یہاں رہ کر کھاتے کیا۔ مجبوراً پھر لکھنؤ بھاگے + یہ نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ مصحفی شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے اور پچیس روپئے ماہوار پانے لگے۔ اور جب انشا شہزادے کی غزلیں بنانے لگے۔ تو اس میں بھی کمی ہوگئی۔ اسی حالت میں گزر کرتے اور غزلیں بیچ بیچ کر اپنا پیٹ پالا کرتے تھے +

یہ مصحفی ہی کا دل گردہ تھا کہ اس حالت میں بھی اکثر درباروں میں جاتے اور مشاعروں میں غزلیں پڑھتے اور اپنے مقابل کی نوک جھونک کو برداشت کرتے تھے۔ انشا میں یہ بڑی عادت تھی کہ وہ اپنے آپ کو بڑھانے کے لئے کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑ دیا کرتے تھے + دلی

ہیں مرزا عظیم بیگ کی مٹی خراب کی اور یہاں انہوں نے مصحفی کو دھر لیا۔ روز کی چھیڑ چھاڑ سے ناک میں دم کر دیا تھا۔ ایک دن مصحفی نے مشاعرہ میں ایک غزل پڑھی اور چلے آئے۔ اس کا مقطع یہ تھا ؎

تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ
تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت ہیں انگلی

ان کے چلے آنے پر یاروں نے خوب لے دے کی اور الٹ پلٹ کر بیچارے کا شعر یوں بنا دیا ؎

تھا مصحفی کانا کہ چھپانے کو پس از مرگ
رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

مصحفی کو جب خبر ہوئی۔ تو انہوں نے ایک غزل لکھی پھر کیا تھا سید انشاء آئیں تو جائیں کہاں۔ وہ خاکہ اڑایا کہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ جب پانی سر سے گزر گیا تو مصحفی کے چند شاگرد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک شہدوں کا سوانگ بھر کر ہجو کے شعر پڑھتے ہوئے انشا کی طرف چلے۔ ان کو بھی خبر ہو گئی۔ یہ اپنے یاروں کو ہمراہ لے کر ان کی پیشوائی کو نکلے۔ اپنے مکان پر لائے

سب کو بٹھا کر وہ اشعار سنے اور خاطر تواضع کر کے انہیں رخصت کیا۔

لیکن اس کا جواب جو انشا نے دیا وہ قیامت کا تھا لوگوں کو جمع کیا اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے ان کو دیں۔ کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے۔ کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ میں گڈا اور دوسرے میں گڑیا۔ دونوں کو لڑاتے تھے۔ اور شعر پڑھتے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن
لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ چنانچہ جب انشاء کا انتقال ہوا۔ تو مصحفی نے ایک غزل کے مقطع میں کہا ؎

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں
یاد ہے مرگِ قتیل اور مردنِ انشا مجھے

مصحفی نے چھہتر برس کی عمر پائی اور ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا۔ لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

ان کی تصنیفوں میں دو تذکرے ہیں - ایک میں فارسی شاعروں کا ذکر ہے اور دوسرے میں شعراے اردو کا تذکرہ ہے - ایک فارسی کا دیوان بھی ہے*

اردو میں انہوں نے بہت کچھ کہا - آٹھ دیوان ترتیب دئے ہوئے اس وقت موجود ہیں - جن میں قصیدے قطعے غزلیں - تاریخیں - مستزاد - مخمس - رباعیاں وغیرہ سب کچھ ہیں - ایک مثنوی بھی ہے - جس کا نام بحر المحبت ہے*

انہوں نے غزلیں بڑی مشکل زمینوں میں کہی ہیں - ہر رنگ میں کہتے تھے - ان کے کلام میں کہیں میر درد کا رنگ ہے - کہیں سودا کا انداز - کہیں سوز کی سادگی - فن کے اصول سے بال برابر ادھر اُدھر نہ سرکتے تھے الفاظ آگے پیچھے کر کے اس طرح جماتے تھے کہ استادی کا حق ادا ہو جاتا تھا - ساتھ ساتھ محاورے کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے*

ان کے قصیدے بھی مشکل زمینوں میں ہیں - کچھ حمد و نعت میں - کچھ مرزا سلیمان شکوہ اور لکھنؤ کے حاکموں کی شان میں - ان میں بڑے بڑے الفاظ - بلند مضمون

فارسی کی عمدہ عمدہ ترکیبیں ان کی درست نشستیں سب موجود ہیں۔ البتہ بندشوں کی چستی اور جوش وخروش کی تاثیر کم ہے۔

چونکہ ان کے قصیدے مشہور نہیں۔ اس لئے ان کا نمونہ نہیں دیا جا سکتا۔ چند غزلیں اور کچھ متفرق اشعار لکھ کر ان کے بیان کو ختم کیا جاتا ہے۔

غزلیں

نہ گیا کوئی عدم کو دل شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت وارماں لے کر

جی ہی جی بیچ بہت شاد ہُوا کرتی ہیں
تیرے عارض کی بلائیں نری مژگاں لیکر

ابکی طرح سے کر دیوینگے عالم کو نہال
ہم جدھر جا دیں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیران قفس باد صبا
خبر آمد ایام بہاراں لے کر

دوستی تھی مجھے ہراک سے گئے تا در قبر

ووش پر نعش مری گبر و مسلمان ہو کر
مصحفی گوشہ عزلت کو سمجھ تخت شہی
کیا کرے گا تو عبث ملک سلیماں لے کر

دن جوانی کے گئے موسم پیری آیا
آبرد خواب ہے اب وقت حقیری آیا
تاب و طاقت رہی کیا خاک کہ اعضا گے تیئں
حاکم ضعف سے فرماں تغیری آیا
شاعری پر کبھی اپنی جو گئی اپنی نظر
نہ ضمیر اپنے ہیں اُس وقت ضمیری آیا
اس کے در پر میں گیا سوانگ بنائے تو کہا
چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا
اے سلیماں ہو مبارک تجھے یہ شاہی و تخت
تیرا آصف بھی بہ ساماں وزیری آیا
چشم کم سے نہ نظر مصحفی خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

کچھ اس کی وضع کچھ ہے وہ پیماں شکن بگڑا
یہ سج دھج ہے تو دیکھو گے زمانہ کا چلن بگڑا

جو چنگ نامہ کو ہم نے اڑایا ہجر کی شب میں
کہیں گے تب کہ تیرا کھیل اب چرخ کہن بگڑا

جیسے سب بانکے اور ٹیڑھے کریں تھے دور سے مجرا
وہی رستہ میں آخر ہم سے کر کے بانکپن بگڑا

بُری صورت سے رہنا ننگ ہے دنیا میں انساں کو
وہ گڑ جاتا ہے خود جیتا جو کوڑی کا بدن بگڑا

ہمیشہ شعر کہنا کام تھا والا نژادوں کا
سفیہوں نے دیا ہے دخل جب سے بس یہ فن بگڑا

نہیں تقصیر کچھ درزی کی اسمیں مصحفی ہرگز
ہماری نادرستی سے بدن کی پیرہن بگڑا

متفرق اشعار

کرینگے خواب راحت یا یہی جنجال ہووےگا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووےگا
ترے کوچے اس بہانے ہمیں دن کو رات کرنا

کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہے گویا چراغ مفلس کا
چھیڑ مت ہر دم نہ آئینہ دکھا
اپنی صورت سے خفا بیٹھے ہیں ہم
فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو
میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں
یار کا صبح تک ہے وعدۂ وصل
ایک شب اور بھی جئے ہے ہے
غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی
کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی
مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو
میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے
کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر
فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی
تو آکے بیٹھے دم نزع جس کی بالیں پر
وہ مر بھی جائے تو آنکھیں کبھی نہ بند کرے

حسرت پہ اس مسافر بیکس کے رو دیئے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے
میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے
ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی
کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

آتش

خواجہ حیدر علی نام ۔ آتش تخلص ۔ ان کے باپ دادا دلّی کے رہنے والے تھے ۔ ان کے باپ کا نام خواجہ علی بخش تھا ۔ یہ نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں دلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغلپورہ میں رہنے لگے ۔

آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے ۔ باپ کی طرح گورے چٹے اور خوبصورت تھے ۔ سیدھے سادے ۔ بھولے بھالے آدمی تھے ۔ رندوں اور آزادوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے ۔ طبیعت میں فقیری کا رنگ بھی تھا ۔ ایک بانکی ٹوپی سر پر ابروؤں تک جھکا کر دھرے جدھر

چاہتے چلے جاتے - اکثر شہر کے جنگلوں میں پھرا کرتے تھے اللہ کے بھروسہ پر زندگی بسر کرتے تھے - کسی شاگرد یا مرید نے کچھ لادیا تو کھا لیا - نہیں تو فاقہ ہی میں مست رہتے تھے ؂

خواجہ آتش ابھی لڑکے ہی تھے اور ان کی تعلیم ابھی پوری نہ ہوئی تھی - کہ طبیعت مشاعروں میں کمال دکھانے لگی + دوستوں کے کہنے سننے سے درسی کتابیں پڑھیں - عربی کافیہ تک پڑھے تھے + بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا - کسی سرپرست کے نہ ہونے سے فوج کے لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہو گئے +

اس زمانہ میں بانکپن اور بہادری کی قدر تھی + نواب محمد تقی ان کو نوکر رکھ کر لکھنؤ لے آئے + یہاں جرأت - انشا اور مصحفی کی شاعری کا گھر گھر چرچا تھا - ان کو بھی شاعری کا شوق ہوا - مصحفی کے شاگرد ہو لئے - اور تھوڑے دنوں کی مشق سے خود ایک طرز کے مالک ہو گئے + غزل کے سوا کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا + زبان کی تراش خراش - صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ پورے استاد

بن گئے۔ پچاس یا ساٹھ روپے ماہوار بادشاہ کے یہاں سے مقرر تھے۔ شاگردوں اور امیروں کے یہاں سے بھی کچھ نہ کچھ آتا رہتا تھا۔

لکھنؤ میں نوازگنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے مادھولال کی چڑھائی مشہور ہے۔ وہاں سے اتر کر ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچّا مکان تھا۔ جو انہوں نے خرید لیا تھا۔ اسی میں رہتے تھے۔ شادی بھی کر لی تھی۔ ایک بیٹا بھی تھا۔ اس کا نام محمد علی جوش تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد اندھے ہو گئے تھے۔

اخیر زمانہ میں محالی خاں کی سرائے میں اٹھ آئے تھے۔ داڑھی بڑھا لی تھی اور اس پر مہندی کا خضاب کرتے تھے۔ ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے۔ سامنے حقہ لگا رہتا تھا۔ ہر کوئی آ کر پی سکتا تھا۔

۱۲۶۳ھ میں ایک دن اچھے خاصے بیٹھے تھے کہ دم نکل گیا۔

حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی آزادی اور کلام کے کمال نے ان کو ظاہری باتوں سے بالکل بے پروا

کر دیا تھا۔ مگر مزاج میں ظرافت ایسی تھی کہ ہر قسم کا خیال لطیفوں میں ادا کرتے تھے ۔

ان کے شاگرد تھے۔ جو اکثر بے روزگاری کی شکایت کر کے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے اور خواجہ صاحب کہا کرتے تھے۔ کہ میاں کہاں جاؤ گے۔ دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو۔ جو خدا دیتا ہے۔ اس پر قناعت کرو ۔

ایک دن وہ شاگرد آئے اور کہا "رخصت ہونے آیا ہوں کل میں بنارس جاتا ہوں۔ کچھ فرمائش ہو تو فرمایئے" آپ ہنس کر بولے "اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا اسلام کہہ دینا" وہ حیران ہو کر بولے "حضرت! یہاں اور وہاں کا خدا کیا کوئی جدا جدا ہے"۔ فرمایا "شاید یہاں کا خدا کنجوس ہے اور وہاں کا کچھ سخی ہے"۔ انھوں نے کہا "معاذ اللہ آپ کیا فرماتے ہیں"۔ خواجہ صاحب نے فرمایا "بھلا سنو تو۔ جب خدا یہاں وہاں ایک ہی ہے تو پھر ہمیں کیوں چھوڑتے ہو۔ جس طرح سے اس سے وہاں جا کر مانگو گے۔ اسی طرح یہاں مانگو۔ جو وہاں دیگا۔ تو یہاں بھی دیگا"۔ یہ بات اس کے دل میں لگ گئی۔ اور

اس نے سفر کا ارادہ چھوڑ دیا۔

تمام عمر کی کمائی غزلوں کا ایک دیوان ہے۔ زبان کی صفائی میں یہ ناسخ کے برابر ہیں اور سوز و گداز میں اُن سے بہت آگے ہیں۔ ان کے یہاں بندشیں چُست ہیں۔ اور مضامین میں شوخی اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ انہوں نے مسلسل غزل بھی لکھی ہے۔ جس میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے ملا ہُوا ہے۔ بلکہ ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے۔ ان کے اشعار میں سرمستی اور فقیرانہ شان پائی جاتی ہے۔

اب ان کی چند غزلیں اور کچھ متفرق اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔ جن سے ان کا رنگ معلوم ہو جائے گا۔

غزلیں

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

کیا کیا الجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے
بخیہ طلب ہے سینہ صد چاک شانہ کیا

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

اُڑتا ہے شوق راحت منزل سے اسپ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا

زینہ صبا کا ڈھونڈھتی ہے اپنی مشت خاک
بام بلند یار کا ہے آستانہ کیا

چاروں طرف سے صورت جاناں ہو جلوہ گر
دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا

صیاد! اسیر دام رگ گل ہے عندلیب
دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے آب و دانہ کیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کریگا زمانہ کیا

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو
دیکھیں تو موت ڈھونڈھ رہی ہے بہانہ کیا

صیاد گلعذار دکھاتا ہے سیر باغ
بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے

آتش غزل یہ تو نے لکھی عاشقانہ کیا

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اس کا دہن بگڑا

کمال دوستی اندیشہ دشمن نہیں رکھتا
کسی بھونرے سے کس دن کوئی ماریاسمن بگڑا

کہا بلبل نے جب توڑا گل سوسن کو گلچیں نے
الٰہی خیر کیجو نیل رخسار چمن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

تونگر تھا بنی تھی جب تک اس محبوب عالم سے
میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیمتن بگڑا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا
بناوٹ کیف مے سے کھل گئی اُس شوخ کی آتش
لگا کر منہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا
نکل اے جان تن سے تا وصال یار ہو حاصل
چمن کی سیر ہے انجام بلبل کو رہائی کا
نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ کارخانہ ہے خدائی کا
دل اپنا آئینہ سے صاف عشق پاک رکھتا ہے
تماشا دیکھتا ہے حسن اس میں خود نمائی کا
نہیں دیکھا ہے لیکن تجھ کو پہچانا ہے آتش نے
بجا ہے اے صنم جو تجھ کو ہے دعویٰ خدائی کا

غبار راہ ہو کر چشم مردم میں محل پایا
نہال خاکساری کو لگا کر ہم نے پھل پایا

برنگ شمع ہم دل سوختوں نے بزم عالم میں
زباں کھولی نہ لیکن بات کرنے کا محل پایا
شکستہ دل نہ ہو انساں عوض ہر شے کا ملتا ہے
موا فرزند اگر تو داغ دل نعم البدل پایا
غضب ہے منزل ہستی میں آسائش طلب ہونا
ہجوم خواب سے رہ رَو نے آخر کو خلل پایا
ہمیشہ جوش گریہ سے رہا پانی میں اے آتش
کبھی تازہ نہ لیکن اپنے دل کا یہ کنول پایا

یہ کس رشک مسیحا کا مکاں ہے
زمیں جسکی چہارم آسماں ہے
خدا پنہاں ہے عالم آشکارا
نہاں ہے گنج ویرانہ عیاں ہے
تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے
برنگ بو ہوں گلشن میں میں بلبل
بغل غنچہ کی میرا آشیاں ہے
شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ
قناعت بھی بہار بے خزاں ہے
سحر ہووے کہیں شبنم کرے کوچ
گل و بلبل کے دریا درمیاں ہے
قد محبوب کو شاعر کہیں سرو
قیامت کا یہ اے آتش زماں ہے

متفرق اشعار

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ کر چلے گئے
میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

جان ہے مجھ نیم جاں کی مرغ بسمل کی تڑپ
ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبر آتش پر نہ یار
دو ہی دن میں پاس الفت اس قدر جاتا رہا

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشاں کوئے دوست

منہ دیکھتا ہوں یار کا کچھ کہہ نہیں سکتا
آنکھیں تو کھلی ہیں مری لیکن ہے زباں بند

کوچہ سے یار کے نہ صبا دور پھینک اسے

مدت کے بعد آئی ہے خاک اپنی راہ پر

کوچہ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں۔

در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

اسے جاں کے برابر مرتے مرتے ہم نے رکھا

ہماری قبر پر رویا کریگی آرزو برسوں

پر کترتا ہے مرے صیاد تو کاٹ اس طرح

حسرت پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر

ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا

زباں غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے

زمیں سے دب گئے دیتے جو آسماں سے نہ تھے

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال

کوئی غربت میں جو آ نکلا ہمارے شہر سے

ان سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام

گر ہی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر میوہ دار راہ میں ہے
مقام تک ہی ہم اپنے پہنچ ہی جائینگے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے
موت مانگوں تو رہے آرزوے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

غالب

اسد اللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ لقب۔ نجم الدولہ۔ دبیر الملک نظام جنگ خطاب تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ پھر غالب ہو گئے۔ والد کا نام مرزا عبد اللہ بیگ تھا ان کا سن ابھی پانچ برس کا تھا۔ کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے ان کی پرورش کی۔ ان کے چچا لارڈ لیک کے لشکر میں رسالدار تھے اور دو پرگنے آگرہ کے پاس سرکار سے ان کے صرف کے لئے مقرر تھے۔ جب چچا مر گئے۔ تو اور وارثوں کے ساتھ ان کے بھی سات سو روپے سالانہ مقرر ہو گئے۔

جو غدر تک ملتے رہے +

بہادر شاہ ظفر نے ان کو تیمور کے خاندان کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا تھا۔ اس سلسلہ میں انہیں پچاس روپے اور بھی ملتے تھے۔ غدر کے بعد یہ تنخواہ بند ہو گئی اور بہادر شاہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے پنشن بھی جاتی رہی دو برس انہوں نے بڑی تکلیفوں میں کاٹے۔ اس کے بعد ریاست رام پور گئے اور نواب یوسف علی خاں ناظم نواب رام پور نے ان کی دو سو روپے تنخواہ مقرر کر دی + تین سال کی کوشش کے بعد پنشن بھی جاری ہو گئی +

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی سے تیرہ برس کے سن میں شادی ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے آگرہ چھوڑ دلّی میں آکر رہنے لگے۔ لیکن دلی میں گھر کبھی نہیں بنایا ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہتے رہے +

شعر و سخن سے ان کی طبیعت کو خاص لگاؤ تھا + فارسی ایک پارسی سے پڑھی تھی۔ جس کا نام ہرمزد تھا + یہ پارسی مسلمان ہو گیا تھا اور اس کا اسلامی نام عبدالصمد تھا۔ عربی میں صرف و نحو کے سوا استاد سے کچھ نہ پڑھا۔

لیکن ان کی عبارت کو دیکھ کر۔ اس کمی کو کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا۔

اردو میں اٹھارہ سو شعر کا ایک انتخاب کیا ہوا دیوان ان کا چھپ گیا ہے۔ اس میں اکثر تمام اور کچھ ادھوری غزلیں ہیں۔ کچھ متفرق اشعار قصیدے اور رباعیاں وغیرہ بھی ہیں۔

ان کا ایک دیوان تھوڑے دن ہوئے۔ بھوپال میں چھاپا گیا ہے۔ اس میں ان کا کلام بھی شامل کر دیا گیا ہے انہوں نے اپنے دیوان سے نکال دیا تھا۔

عود ہندی اور اردوئے معلے ان کے خطوں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ اور فارسی میں بھی تصنیفیں ہیں۔

آخر عمر میں بڑھاپے کی وجہ سے بہت پریشان ہو گئے تھے۔ آخر کار ۷۳ برس کی عمر پا کر ۱۲۸۵ھ میں انتقال کیا۔ "آہ غالب بمرد" ان کے مرنے کی تاریخ ہے۔

مرزا بہت خوش اخلاق تھے۔ وہ ہر شخص سے ہنسی خوشی ملتے تھے۔ جو ایک دفعہ ان سے مل لیتا تھا۔ وہ دوسری بار پھر ان سے ملنا چاہتا تھا۔ مرزا کی آمدنی بہت کم تھی۔

لیکن بڑے حوصلہ کے آدمی تھے۔ کوئی فقیر ان کے دروازہ سے خالی نہ پھرتا تھا۔ حافظہ غضب کا تھا۔ شعر کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ مرزا گوشت کو بہت پسند کرتے تھے جو کھانا ان کے لئے گھر میں سے آتا تھا۔ اُس میں صرف پاؤ بھر گوشت کا قورمہ ہوتا تھا۔ ایک پیالے میں بوٹیاں دوسرے میں شوربا۔ جس میں چپاتی کا چھلکا بھیگا ہوا۔ ایک پیالی میں کبھی کبھی انڈے کی زردی اور دوسری پیالی میں دو تین پیسے بھر دہی بھی ہوتا تھا۔ شام کو کسی قدر شامی کباب یا سیخ کے کباب ان کے دستر خوان پر ہوتے تھے۔

ایک روز دستر خوان بچھا۔ برتن تو بہت تھے اور کھانا تھا کم۔ مسکرا کر کہنے لگے "اگر برتنوں کی زیادتی پر خیال کیا جائے۔ تو میرا دستر خوان یزید کا دستر خوان ہے اور اگر کھانے کو دیکھا جائے تو بایزید کا۔

اس میں بات یہ ہے کہ یزید کے دستر خوان پر بہت سے کھانے ہوتے تھے۔ اور بایزید ایک اللہ والے آدمی تھے۔ ان کے دستر خوان پر جَو کی روٹی اور نمک کے سوا

کچھ بھی نہ ہوتا تھا ۔

مرزا صاحب کو آم بہت بھاتے تھے ۔ آم کی فصل میں ان کے دوست دور دور سے انہیں آم بھیجا کرتے تھے ۔ خود بھی اکثر اپنے دوستوں سے تقاضا کر کے آم منگوایا کرتے تھے ۔

ایک روز بہادر شاہ چند مصاحبوں کے ساتھ حیات بخش باغ میں ٹہل رہے تھے ۔ غالب بھی ساتھ تھے ۔ آم کے پیڑ رنگ رنگ کے آموں سے لد رہے تھے ۔ مرزا کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ اور مشکل یہ تھی کہ یہاں کے آم بادشاہ یا بیگموں کے سوا کسی کو نصیب نہ ہوتے تھے ۔ اب کریں تو کیا کریں ۔ مرزا بار بار آموں کی طرف حسرت سے دیکھنے لگے ۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا اتنا غور کر کے کیا دیکھتے ہو" کہنے لگے "حضور! بزرگوں سے سنا ہے کہ ہر دانہ پر کسی نہ کسی کا نام لکھا ہوتا ہے ۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرا نام بھی کسی دانہ پر لکھا ہوا ہے یا نہیں" ۔ بادشاہ مسکرائے ۔ اور اسی روز آموں کی ایک بہنگی مرزا کو بھجوا دی ۔

ہنسی مذاق کی باتیں بہت زیادہ کیا کرتے تھے +
ایک دفعہ جب رمضان گذر چکا۔ تو مرزا قلعہ میں گئے+ بادشاہ
نے پوچھا "مرزا تم نے کتنے روزے رکھے"۔ عرض کی "پیرومرشد
ایک نہیں رکھا" +

ایک صاحب تھے۔ جن کا نام سید سردار مرزا تھا۔
یہ ایک دن شام کو غالب سے ملنے آئے + جب تھوڑی
دیر ٹھہر کر وہ جانے لگے۔ تو مرزا خود اپنے ہاتھ میں شمع
لے کر کھسکتے ہوئے آئے۔ تاکہ روشنی میں جوتا دیکھ کر پہن
لیں + انہوں نے کہا "قبلہ وکعبہ! آپ نے کیوں تکلیف
فرمائی۔ میں اپنا جوتا ڈھونڈ کر پہن لیتا"۔ مرزا نے کہا "میں
آپ کا جوتا دکھانے کو شمع نہیں لایا۔ بلکہ اس لئے لایا ہوں
کہ کہیں آپ میرا جوتا نہ پہن جائیں +

ایک دن سورج ڈوبنے سے پہلے مرزا صاحب شام
کا کھانا کھا رہے تھے۔ اور کھانے میں صرف شامی کباب
تھے + مولانا حالی بھی وہاں موجود تھے۔ اور ان کے سامنے
بیٹھے ہوئے رومال سے مکھیاں ہٹا رہے تھے + مرزا نے
کہا "آپ ناحق تکلیف فرماتے ہیں۔ میں ان کبابوں

ہیں سے آپ کو کچھ بھی نہ دوں گا۔" پھر آپ ہی یہ حکایت بیان کی کہ نواب عبدالاحد خاں کے دسترخوان پر دوست احباب اور عزیزوں کے لئے ہر قسم کے کھانے چنے جاتے تھے۔ مگر خاص ان کے لئے ایک چیز الگ تیار ہوتی تھی وہ اس کے سوا کچھ نہ کھاتے تھے۔ ایک دن ان کے لئے مزعفر رکھا تھا۔ وہی ان کے آگے لگایا گیا۔ ایک ڈوم بہت منہ چڑھا تھا۔ جو اس وقت دسترخوان پر موجود تھا۔ نواب نے اس کو کھانا دینے کے لئے خالی رکابی طلب کی۔ اس کے آنے میں دیر ہوئی۔ نواب کھانا کھاتے جاتے تھے۔ اور رکابی مانگتے جاتے تھے۔ وہ ڈوم آگے رومال ہلانے لگا اور کہا "حضور! اور رکابی کیا کیجئے گا۔ اب یہی خالی ہوئی جاتی ہے۔ نواب پھڑک گئے اور وہی رکابی اس کے سامنے سرکا دی۔

طبیعت میں شوخی اور چلبلا پن ہونے کے ساتھ یہ ذہین بھی بہت تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بہت حاضر جواب تھے۔ فوراً شعر کہتے اور مصرع پر مصرع لگاتے تھے۔

مولوی کرم حسین ایک دوست تھے۔ انہوں نے

ایک مجلس میں چکنی ڈلی اپنی ہتھیلی پر رکھ کر کہا کہ اس
کی تشبیہیں نظم کیجئے + انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے نو دس
شعر کہہ دیئے - اور صلہ میں وہ چکنی ڈلی ان سے لے
لی + وہ شعر یہ ہیں ؎

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے
اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجے
خال مشکیں رخ دلکش لیلا کہئے
حجر الاسود و دیوار حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہئے
صومعہ میں اسے ٹھیرایئے گر مہر نماز
میکدہ میں اُسے خشت خم صہبا کہئے
اپنے حضرت کے کف دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

مرزا کو مدت سے سونے کے وقت شراب پینے کی عادت

تھی ۔ جو مقدار انہوں نے باندھ لی تھی۔ اس سے زیادہ کبھی نہ پیتے تھے۔ لیکن پھر بھی اس نے مرزا کی تندرستی کو خراب کر دیا تھا۔

جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں مرزا کے گھر آئے۔ آپ نے ان کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ ان کا منہ تکنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ پیجئے انہوں نے کہا "میں نے تو توبہ کر لی۔" آپ تعجب کر کے بولے "ہیں۔ تو کیا جاڑے میں بھی؟"

ایک صاحب نے ان کے سنانے کو کہا "شراب پینا سخت گناہ ہے۔" آپ نے ہنس کر کہا "بھلا اگر کوئی پیئے۔ تو کیا ہوتا ہے۔" انہوں نے کہا "ادنیٰ بات تو یہ ہے کہ دعا نہیں قبول ہوتی۔" مرزا نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ شراب پیتا کون ہے؟ اول تو ایک بوتل سامان کے ساتھ سامنے ہو۔ دوم بے فکری ہو۔ تیسرے صحت قائم ہو۔ آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو۔ اُسے اور کیا چاہئے۔ جس کے لئے دعا کرے۔"

مرزا کی بیوی نہایت پرہیزگار اور روزے نماز

کی پابندی بی تھیں - اور اپنے میاں کی ہر بات کا خیال رکھتی تھیں + میاں بیوی میں بہت اچھے تعلقات تھے مگر چونکہ مرزا کی طبیعت میں شوخی زیادہ تھی - اس لئے زبان اور قلم سے بعض ایسی باتیں نکل جاتی تھیں - جن کو سن کر نا واقف آدمی نفرت یا بے تعلقی سمجھتے تھے*

جاڑے کے موسم میں ایک دن طوطے کا پنجرہ سامنے رکھا ہُوا تھا - طوطا سردی کے مارے پروں میں منہ چھپائے بیٹھا تھا - مرزا نے دیکھ کر کہا " میاں مٹھو! نہ تمہارے جورو نہ بچے - پھر تم کس فکر میں سر جھکائے بیٹھے ہو"*

ایک دفعہ مرزا مکان بدلنا چاہتے تھے + ایک مکان آپ خود دیکھ کر آئے - اس کا دیوان خانہ تو پسند آگیا - مگر اندر کا مکان نہ دیکھ سکے + گھر پر آکر اس کے دیکھنے کے لئے بیوی کو بھیجا + وہ دیکھ کر آئیں - تو ان سے پسند ناپسند کا حال پوچھا + انہوں نے کہا " اس میں تو لوگ بلا بتاتے ہیں " - مرزا نے کہا " اچھا - تو کیا دنیا میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی بلا ہے؟"

فارسی میں ایک شاعر گزرا ہے - جو بہت مشکل شعر

کہا کرتا تھا۔ اس کا تخلص بیدل تھا + مرزا پہلے اسی شاعر کے رنگ میں کہا کرتے تھے + اس کے بعد نازش کی روش اختیار کی۔ لیکن بعد میں یہ راہ چھوڑ دی اور میر کی طرز میں کہنے لگے + ان کے کلام میں وہ سب خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جو فارسی کے اخیری شاعروں میں پائی جاتی ہیں +

یہ ایک بہت بڑے مضمون کو ایک شعر میں ادا کر دیتے تھے۔ ان کے کلام میں تشبیہیں اور استعارے نئے نئے پائے جاتے ہیں + بعض شعر جوش سے بھرے ہوئے ہیں + ان میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ غزل کہتے کہتے دو چار شعر ممدوح کی مدح میں بھی کہہ جاتے ہیں + انہوں نے درد و غم۔ حسرت و تمنا اور نا امیدی و ناکامی کے مضمون خوب خوب باندھے ہیں۔ اور ان میں میر کے رنگ کی پیروی کی ہے + اچھے اچھے معنی کے ساتھ ان کے کلام میں الفاظ۔ بندشیں اور ترکیبیں بھی عجیب عجیب اور نہایت اچھی پائی جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں صنعتیں نہیں ہیں۔ لیکن رعایت لفظی ان کے کلام

ییں اکثر جگہ پائی جاتی ہے ٭

انہوں نے غزلوں کے علاوہ قصیدے بھی کہے ہیں اب ہم اول قصیدہ کا نمونہ یہاں لکھتے ہیں - پھر چند غزلیں اور کچھ متفرق اشعار تحریر کر کے ان کے بیان کو ختم کرتے ہیں ٭

قصیدہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام ۔۔۔ جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح ۔۔۔ یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب ۔۔۔ بندہ عاجز ہے گردش ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا ۔۔۔ آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرور خاص خواص ۔۔۔ حبذا اے نشاط عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے ۔۔۔ لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا ۔۔۔ صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا ۔۔۔ تیرا آغاز اور ترا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے ۔۔۔ مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ۔۔۔ ایک ہی ہے امید گاہ انام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش
غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بہ طرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قُربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن ماہتاب بن میں کون
مجھ کو کیا بانٹ دیگا تو انعام

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوے بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دیگا مجھے مئے گلفام

جبکہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکی قطع تیری تیزیِ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر
کوے و مشکوے و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

غزلیں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں اگر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبکسر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا

تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بیمہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن

خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

ابن مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار　　یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں　　کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا　　اور درویش کی دعا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

متفرق اشعار

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا

زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہاے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

یارب نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی نہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں
غم دنیا سے گر پائی بھی مہلت سر اٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیری یاد آنے کی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی
بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائیگی
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے
گرچہ ہے کیا کیا برائی سے ولے با اینہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا

مَیں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نامرادی اس کی دیکھا چاہیئے
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھوں ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

مومن

محمدؒ مومن خاں نام۔ مومن تخلص۔ حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے + ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے۔ جب ہوش سنبھالا۔ تو مولانا شاہ عبدالقادر سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ جب استعداد اچھی ہو گئی۔ تو اپنے باپ اور چچا سے طب کی کتابیں پڑھیں +

اسی زمانہ میں نجوم کا شوق پیدا ہوا۔ اس کو بھی اہل کمال سے حاصل کیا۔ اور بڑی مہارت حاصل کی۔ شعر و سخن سے طبیعت کو خاص لگاؤ تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ پھر اصلاح لینی

چھوڑ دی ٭

رنگین طبیعت۔ خوش وضع۔ خوش لباس آدمی تھے۔ غزل کو گا کر پڑھتے تھے ٭ جوانی میں مولانا سید احمد شہیدؒ کے مرید ہوئے ٭ کلیات میں ایک مثنوی جہاد پر ہے۔ جو اُس وقت لکھی گئی تھی۔ جب سید صاحب سکھوں سے جہاد کر رہے تھے ٭

مومن خاں نے باون برس کی عمر پائی۔ سنہ ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا۔ میدھیورہ میں دلی دروازہ کے باہر شاہ عبدالعزیز کے مقبرہ کے پاس دفن ہوئے ٭

کلیات میں قصیدے بھی ہیں۔ جو بہت بلند ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی کوئی قصیدہ صلہ کی امید پر نہیں کہا۔ چند قصیدے نعت اور خلفائے راشدین اور حسنینؑ کی منقبت میں ہیں ٭

کلیات میں آٹھ نو مثنویاں ہیں۔ جن میں سے دو ناتمام ہیں۔ ان کا انداز وہی ہے۔ جو غزلوں کا ہے٭

دیوان میں مخمس۔ مسدس۔ مرثیہ وغیرہ سبھی کچھ ہیں۔ اور سب میں ان کا رنگ جھلکتا ہے ٭ اس کلیات

کو پہلے ان کے شاگرد نواب شیفتہ نے جمع کیا تھا۔ پھر ان کے داماد تسکین نے دوبارہ مرتب کر کے چھپایا۔

اس کے علاوہ ان کا دیوان فارسی بھی چھپ گیا ہے وہ اپنے رنگ میں لاجواب ہے۔ ان کے خیالات نہایت نازک اور مضمون بلند ہیں۔ ان کا کلام استعارہ اور تشبیہہ کے زور سے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا ہے۔ ان میں حسن و عشق کی باتیں بڑے مزے میں ادا کی ہیں۔ اسی وجہ سے جو شعر صاف ہوتا ہے۔ اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے۔ اکثر عمدہ ترکیبیں اردو میں استعمال کر کے کلام کو نمکیں بنا دیتے ہیں۔ یہ ان کی خصوصیات میں ایک خاص چیز ہے۔ جو غالب کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ مومن خاں شعر میں مضمون کے بعض حصے چھوڑ جاتے ہیں۔ جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اور شعر مشکل اور پیچیدہ بھی ہو جاتا ہے۔

نمونہ:۔

غزلیں

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بیمروت کس سے دیکھا جائے ہے

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

حال دل کس سے کہوں میں کس سے دیکھا جائے ہے
سر اٹھے بالیں سے کیا کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایماں عقل و ہوش
ہائے کیا کہئے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

غیر کے ہمراہ وہ آتا ہے میں حیران ہوں
کس کے استقبال کو جی تن سے نکلا جائے ہے

جان نہ کھا وصل عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کہہ کے گل شمع شبستاں ہوں گے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
کل تو ہم خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

ہم نکالیں گے سن اے موج ہوا بل تیرا
اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

اڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

کشتہ ہوں اُس کی چشم فسونگر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوے اعجاز دیکھنا

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومن غم مآل کا آغاز دیکھنا

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اس بیوفا کے آنے کی

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے
سکھائی طرز اُسے دامن اٹھا کے آنے کی

چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو راہ
تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی

پھر اب کے لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی
کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے
اجل بھی رہ گئی ظالم سنا کے آنے کی
مرے جنازے پہ آنے کا ہے ارادہ تو آ
کہ دیر اٹھانے میں کیا ہے صبا کے آنیکی
مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلی کو روز جفا کے آنے کی

متفرق اشعار

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤنگا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا
کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اللہ ری ناتوانی جب شدت قلق میں
بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا
اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل

میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ وپے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا
کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے آساں ہوگا

نہ مانوں گا نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

بیخود تھے غش تھے محو تھے دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
خنجر تو نہ توڑ سخت جانی
پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو
کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے
اگر غفلت سے باز آیا جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
کسی نے گر کہا مرتا ہے مومن
کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

ذوق

نام محمد ابراہیم۔ ذوق تخلص کرتے تھے + یہ دلی کے رہنے والے اور شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کے باپ نواب لطف علی خاں کے یہاں خواجہ سرا تھے۔ یہ کابلی دروازہ کے قریب رہتے تھے +

ذوق ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے + حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی + حافظ صاحب شاعر بھی تھے انہیں کی دیکھا دیکھی ان کو بھی شاعری کا شوق ہوا۔ کچھ کچھ کہنے لگے + جب ذرا سمجھدار ہوئے۔ تو شاہ نصیر سے

اصلاح لینے لگے - اور ضرورت پڑنے پر فارسی اور عربی
کی چند کتابیں بھی پڑھ لیں - طبیعت چلتی ہوئی تھی -
چند روز میں شاعری کی مشق بڑھ گئی - مشاعروں میں
جاتے تھے اور غزلیں پڑھتے تھے - ہوتے ہوتے مرزا
ابوظفر کے دربار میں پہنچ ہو گئی - جو اس زمانہ میں ولیعہد
تھے - کچھ دنوں بعد وہ ان کے شاگرد ہو گئے اور اپنا کلام
انہیں دکھانے لگے - پہلے پہل چار روپے ماہوار تنخواہ
مقرر ہوئی - دوسرے سال پانچ ہو گئے - لیکن ولی عہد
بہادر کی حضور سے انعام اکرام پاتے رہتے تھے - اس
زمانہ میں انہوں نے اکبر شاہ ثانی کی شان میں ایک قصیدہ
کہا اور اس کے صلہ میں ان کو "خاقانی ہند" کا خطاب ملا -
جب ابوظفر بادشاہ ہوئے تو انہوں نے سو روپے ماہوار
ان کی تنخواہ مقرر کر دی - اور کچھ دنوں بعد ایک گاؤں
بھی عنایت فرمایا -

ذوق میانہ قد کے آدمی تھے - رنگ سانولا - چیچک
کے داغ چہرہ پر زیادہ تھے - آنکھیں روشن اور نگاہیں
تیز تھیں - چہرہ کا نقشہ لمبوترا تھا - اور بدن میں پھرتی

پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ آواز بلند تھی۔

غدر میں ان کا سارا کلام ضائع ہو گیا۔ ان کے ایک شاگرد نے ایک مختصر سا دیوان مرتب کیا اور چھپوا دیا جس میں اکثر غزلیں ادھوری ہیں۔ بہت دنوں کے بعد پروفیسر آزاد نے کوشش کر کے ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا۔ جس میں کچھ ادھوری نظموں کو پورا کیا گیا۔ کچھ غزلیں اور قصیدے بھی بڑھ گئے۔ اگر ان کا کلام ضائع نہ ہو جاتا۔ تو تین چار بڑی بڑی جلدوں سے بھی بڑھ جاتا۔

یہ اپنے کلام میں مضمون تازہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کلام کی صفائی۔ ترکیب میں چستی۔ محاورہ کی خوبی اور عام فہمی ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔ مگر ان کی شاعری کا رنگ بدلتا رہا ہے۔ اول اول مرزا سودا کے رنگ میں کہتے تھے۔ پھر میر درد کے انداز کو پسند کرنے لگے۔ مرزا ابوظفر نوجوان تھے اور وہ جرأت کی طرز کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس لئے ذوق کی غزلیں جرأت کے رنگ میں بناتے تھے۔ سودا کے بعد ان کے قصیدوں

کا نمبر ہے - ان کے یہاں بھی فارسی شاعروں کے قصیدوں کا سا زور پایا جاتا ہے ۔

انہوں نے ایک مثنوی بھی کہی تھی - جس کا نام نامہ جانسوز تھا - اس میں اول حمد و نعت ہے - پھر ساقی نامہ پھر معشوق کا انتخاب اور اسی میں اس کا سراپا - اس کے بعد گزرے ہوئے زمانہ کی یاد - اس میں انہوں نے چاروں موسموں کی حالت بھی لکھی ہے ۔

کئی مخمس - کئی رباعیاں اور بہت سی تاریخیں بھی انہوں نے کہی تھیں - مرثیے اور سلام بھی لکھے تھے ۔

اخیر میں اکثر بیمار رہتے تھے - غدر سے دو برس پہلے ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ دست آنے لگے - جس سے ضعف بہت ہو گیا - اور چارشنبہ کی رات کو وفات پائی - دوسرے روز جنازہ بڑے شان و شوکت سے اٹھا - خواجہ باقی باللہ کے قریب دفن ہوئے - بادشاہ کی کہی ہوئی تاریخ لوح مزار پر کھدی ہوئی ہے ۔

ایک قصیدہ کا ایک ٹکڑا یہاں درج کیا جاتا ہے - جس سے ان کے قصیدہ کی شان معلوم ہو گی ۔

قصیدہ

شب برات کی وہ روشنی کہ صل علیٰ
ہو روز عید اگر آئے سامنے شب تار

چیونٹیوں پہ ہوئی روشنی تو شور اٹھا
فلک نے کھینچی زمیں پر ستاروں کی دیوار

دیا ہے لا یا ارسطو طلسم یوناں سے
کھلایا سد سکندر میں چیں کا گلزار

لگے ستاروں کو جب آگ دینے آتش باز
تو بولے اہل نظر دیکھا ہے طرفہ بہار

نہ دینگے آگ کا دانہ جب اپنے موروں کو
تو آکے ہووینگے طاؤس خلد اُنپہ نثار

جب اک طرف کو لگی جگمگانے چادر گنج
زمیں پہ سب کو نظر آئی آسماں کی بہار

ہمارے کانوں کے پردے تو اڑ گئے اسدم
پٹاخے کرنے لگے چھٹکے جب بہم تکرار

پکارے سب کہ تو اعدہے فوج میں شاید

کہ تیر اڑ رہے ہر سمت میں ہیں قضا تیغ

عجب تماشا ہوا پتلیوں کو جب دی آگ

کہ ناچنے لگے مل کر ثوابت و سیار

ہوائی کہتی تھی جا کر شہاب ثاقب سے

کہ تو زیادہ ہے یا میں فزوں ہوں آتشیا

ہیں ابر طور سے برسے زمیں پہ نور کے پھول

زمیں تو تودہ گل بن گئی آسماں گلبار

اب چند غزلیں دیکھو:-

غزل

لکھیے اسے خط میں کہ ستم اٹھ نہیں سکتا — پر ضعف سے ہاتھوں سے قلم اٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورت تصویر نہالی — کیا اٹھے سر بستۂ غم اٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرس ناقۂ لیلیٰ — پر حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا

جوں دانہ روئیدہ تہ خاک ہمارا — سر زیر گرانبار الم اٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں — سر میرا ترے سر کی قسم اٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گرانبار ہے جو رخت سفر بھی — اے راہرو ملک عدم اٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق

کچھ فائدہ بے دست کرم اٹھ نہیں سکتا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا دل مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

کیا جانے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

آتا ہے دم آنکھوں میں دم حسرت دیدار
پر لب پہ کبھی حرف تمنا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارا نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے آنا بھی ہے دم کا یا نہیں آتا

غافل ہے بہار چمن عمر جوانی
کر سیر کہ موسم یہ دوبارا نہیں آتا

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے
آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

سر بوقت ذبح اپنا۔ اُس کے زیر پائے ہے
یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

واہ وا شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس کس طرح سے کھائے ہے

دم کی ہے سینہ میں آکر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھئے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بس کرم سوز دروں بھن جائیں گے دل اور جگر
رحم جوش گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

نزع میں بھی ذوقؔ کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش ہو جائے ہے

اسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا — اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا
جس انساں کو سگ دنیا نہ پایا — فرشتہ اس کا ہم پایہ نہ پایا
مقدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے — تو یاں ہم نے نہ کچھ کھویا نہ پایا
سراغ عمر رفتہ ہاتھ کیا آئے — کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا
رہا ٹیڑھا مثال نیش کژدم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
وہ از خود رفتہ ہوں جسکو خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈھا نہ پایا

یہی ہردم ہے زخم دل کا رونا	دہن پایا لب گویا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم	غرض خالی دل شیدا نہ پایا

تدبیر اس کا کہاں عالم میں اے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو سو ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا آہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہیں جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے باد صبا اب کبھی چلے

متفرق اشعار

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پر آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں
وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

سینہ و دل پہ مرے زخم و جگر ہنستے ہیں
ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تونے مارا
وہ نصیب اس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتے ہو
وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

دیکھا دم نزع دل آرام کو
عید ہوئی ذوقؔ ولے شام کو

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

اے ذوق دیکھ دختر زر کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

سراغ عمر گذشتہ کا کیجئے گر ذوق
تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

اگر اٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے
لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی
آپ کی گر یوں خوشی ہے مہرباں یونہی سہی



مرزا دبیر

مرزا سلامت علی نام تھا اور دبیر تخلص کرتے تھے
ان کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا + ان کے بزرگ
دہلی کی سلطنت میں بڑی بڑی جگہوں پر رہے ہیں + مرزا
صاحب ۱۱ رجمادی الاول سنہ ۱۲۱۸ھ کو دلی میں پیدا ہوئے
چھ سات برس کی عمر میں باپ کے ساتھ لکھنؤ آئے +
فارسی عربی کی کتابیں لکھنؤ کے بڑے بڑے عالموں
سے پڑھیں۔ شاعری سے قدرتی لگاؤ تھا + میر مظفر حسین
ضمیر اس زمانہ کے بہت بڑے مرثیہ گویوں میں شمار
ہوتے تھے۔ ان کی مجلسوں میں یہ بھی شریک ہوتے

تھے - ہوتے ہوتے ان کو بھی شوق پیدا ہوا + ابھی ان کی عمر صرف ۱۲ سال کی تھی اور تعلیم پا رہے تھے - کہ انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا - میر ضمیر کے شاگرد ہوئے + انہیں نے اپنے تخلص پر ان کا تخلص دبیر رکھا + مرزا صاحب سولہ سترہ برس کے تھے - کہ ان کی شاعری کا شہرہ سارے لکھنؤ میں ہو گیا - اور بڑے بڑے رئیس شہزادے ان کے مکان پر حاضر ہونے لگے + ادھر محلات میں کئی بیگمیں اور شہزادیاں ان کی شاگرد ہو گئیں ❊

جب تک اودھ کی سلطنت قائم رہی - انہوں نے لکھنؤ سے باہر قدم نہیں رکھا - مگر ۵۷ء کے غدر کے دو برس بعد نواب امام باندی بیگم صاحبہ کی طلب پر پٹنہ عظیم آباد تشریف لے گئے - پھر ہر سال وہاں جاتے رہے + آخر کار ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی اور اپنے ہی مکان میں دفن ہوئے - چوہتر برس کی عمر پائی ❊

مرزا صاحب کے کلام میں سب سے بڑی بات تشبیہوں اور استعاروں کی خوبی ہے - خیال کی بلندی مشکل پسندی اور مبالغہ ان کی مرثیہ گوئی میں زیادہ پایا جاتا ہے + زبان

کی صفائی ۔ بندش کی چستی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر بھی اکثر جگہ بہت خوب کھینچے ہیں ؛

کلام کے نمونے :۔

طلوع سحر

جب مئے نور سے لبریز ہوا جام سحر
شان معبود نمایاں ہوئی ہنگام سحر
محو طاعت ہوئے شاخوں پہ گل اندام سحر
خیط ابیض کا نشاں تھا کہ وہ صمصام سحر
تر و تازہ ہوئے بے جانوں نے جانیں پائیں
حال دل کہنے کو غنچوں نے زبانیں پائیں

باغ جنت تھا دم صبح وہ پھولا گلزار
جس طرف دیکھئے پھولوں کے لگے ہیں انبار
دھو دیا شبنم تازہ نے رخ گل کا غبار
بڑھ گئی اور غدار گل شبو کی بہار
دیکھیں مٹی میں زبسے قدرت باری نہریں

آب گوہر کی رگ گل پہ نہیں جاری نہریں
ہے نئے رنگ کی گلشن میں شگوفہ کاری
جامۂ زیبا چمن پہنے ہیں خلعت بھاری
ہے نیا باغ نئے رنگ کی ہے تیاری
تازہ پھولوں کی وہ بوباس وہ رنگت پیاری
ڈالیاں جھکتی ہیں ایک ایک سے ملنے کے لئے
پھول جامے میں سماتے نہیں کھلنے کیلئے
وہ سماں صبح کا وہ سرد بیاباں کی ہوا
طائروں کی وہ سر شاخ خوش آیند صدا
وہ لب غنچۂ سوسن پہ تبسّم کی ادا
خود بخود دل میں کبھی خندۂ بیجا پہ حیا
قہقہۂ گل کا نہ آہنگ فغاں بن جائے
لب سوسن کی اُوداہٹ نہ دھواں بنجائے
وجد میں ڈالیوں پر بلبل شیدا کی چہک
سرد شبنم سے ہوئی آتش لالہ کی بھڑک
بڑھ گیا حسن ملیح گل سوسن کا نمک
آنکھیں ہوتی ہیں خنک دیکھ کے سبزے کی لہک

دل یہ کہتا ہے عجب منظر لاثانی ہے
صحن گلشن میں بچھا مخمل کا شانی ہے
زلف سنبل کی ہوئی ختم پریشاں حالی
جھک کے اک اک سے گلے ملنے لگی ہر ڈالی
بڑھ گئی مثل شفق عارض گل کی لالی
جس طرف جھوم کے جا پہنچی صبا متوالی
لب شکر ریز ہوئے خندہ نما پھولوں کے
پھول کر ٹوٹ گئے بند قبا پھولوں کے

آئی گلشن میں خزاں باد سحر کے ہمراہ
پھول کر پھول گرے برگ و ثمر کے ہمراہ
سیل شبنم ہے رواں نرگس تر کے ہمراہ
جس طرح آب ہے موتی کی گہر کے ہمراہ
باغ ویراں ہوا گلشن سے خزاں جاتی ہے
خالی دامن کو لئے باد صبا آتی ہے

رفتہ رفتہ شہ خاور جو سر بام آیا
سبزہ مرجھا کے یہ پامال ہوا کام آیا
لب غنچہ پہ جو شبنم کا کہیں نام آیا

لے کے گلچیں چمن قتل کا پیغام آیا
خشک فوارے ہیں نہریں ہیں برابر خالی
دست سائل میں ہوں جیسے کف ساغر خالی
عارض گل پہ پڑا ہے جو بیاباں کا غبار
جھونکے دے دے کے اڑاتی ہے اسے باد بہار
گرد پھرتی ہے تصدق کے لئے سو سو بار
زلف سنبل پہ نظر آئے جو قطرے دو چار
دامن دشت سے سنبل کے جو گیسو پہنچے
دیدۂ نرگس خونبار کے آنسو پہنچے

صبح کا سماں

وہ سماں دشت کا وہ نور کا تڑکا وہ بہار
صنعت صانع قدرت کا وہ تھا نقش و نگار
وجد میں لاتی تھی خوشبوئے گل وحدت ہزار
کبھی شاخوں کا وہ جھکنا کبھی اٹھنا ہر بار
شان دکھلانے کو جو نخل تھا آمادہ تھا
زلف سنبل بھی سنوارے ہوئے استادہ تھا

سبزہ وہ جس سے تجل رنگ سپہر اخضر
موتی پھیلے ہوئے شبنم کے اِدھر اور اُدھر
سرد نہریں کہ جنہیں دیکھ کے ٹھنڈا ہو جگر
وہ حبابوں کی چمک جیسے فلک پر اختر
بڑھ کے غنچوں کے دہن مرغ چمن چومتے تھے
قمریاں بولتی تھیں سروسہی جھومتے تھے

گل شبو کی سحر کو وہ بہار ایک طرف
جلوہ گر ایک طرف برگ نو بار ایک طرف
روشوں پر وہ صنوبر کی قطار ایک طرف
ڈالیاں پہنے ہوئے پھولوں کے ہار ایک طرف
خرم و تازہ و تر دشت بھی گلزار بھی تھا
تر زباں ذکر الٰہی میں ہر اک خار بھی تھا

شمع و پروانہ کا وہ سوز و گداز ایک طرف
بلبل و گل میں نئے راز و نیاز ایک طرف
طوطی تیز زباں نغمہ طراز ایک طرف
چمنستاں کے حسینوں کا وہ ناز ایک طرف
نور ہنگام سحر دیکھ کے خورسند کوئی

کوئی خنداں تھا چمن میں تو شکر خند کوئی
تھا ہر اک صحن چمن طعنہ زن چرخ بریں
جا بجا تازہ وہ خوشی کہ خجل ہو پروین
خاک پر فرش گلوں کا وہ نہالوں کے قریں
تھی یہ بالیدہ کہ پھولوں نہ سمائی تھی زمیں
رنگ نازک جو ہر اک گل کی کلی رکھتی تھی
پھونک کر پاؤں نسیم سحری رکھتی تھی

نمود صبح

پھولا جب آسماں پہ گل آفتاب صبح
نکلا حجاب شب سے رخ لاجواب صبح
دفتر کشائے صبح نے کھولی کتاب صبح
ہونے لگا سپہر بریں پر حساب صبح
گردوں پہ حاملان سحر کا ظہور تھا
عالم تمام مطلع خورشید نور تھا
غنچے کھلے نسیم ریاض جناں چلی
باغ جہاں میں صرصر عنبر فشاں چلی

گلشن سے مارے شرم کے بادِ خزاں چلی
ہنس کر کہا بہار نے کیوں اب کہاں چلی
سیرِ چمن تو کر کہ مراد دور دور ہے
غنچے کھلے ہیں رنگ گلستاں اب اور ہے
یہ تازگی یہ بو یہ لطافت یہ رنگ ڈھنگ
کیونکر نہ ان کو دیکھ کے غنچے ہوں دل میں تنگ
بدلے جو چرخِ شعبدہ پرداز لاکھ رنگ
پیدا نہ ہوں گے ایسے جوانانِ سبزہ رنگ
دنیا میں ان گلوں سے یہ گلشن بھرا رہے
یارب سدا ریاضِ پیمبر ہرا رہے
وہ صبح اور وہ نور کا تڑکا وہ سبزہ زار
گلہائے بوستانِ پیمبر کی وہ بہار
تھی شاخِ گل پہ بلبلِ سدرہ کی یہ پکار
قربان باغِ مرتضوی پر ہزار بار
رونق انہیں کے دم سے ہے دنیائے زشت میں
ایسے تو گل کھلے بھی نہ ہوں گے بہشت میں
شبنم تھی یوں گلوں پہ دُرافشاں دمِ سحر

جس طرح چاندنی پہ لٹائے کوئی گہر
بادِ صبا کا ناز سے چلنا اِدھر اُدھر
نغمے وہ بلبلوں کے وہ پھولے پھلے شجر
بلبل کا اس بہار سے دل باغ باغ تھا
ارضِ عُلا کا عرش بریں پر دماغ تھا

ٹھنڈی ہوا وہ دشت کی وہ صبح کا ظہور
نغمے محو یادِ حق ہیں درختوں پہ سب طیور
پھیلا جو آفتاب فلک کا جہاں میں نور
گل ہو گیا نسیم سحر سے چراغ طور
ظلمت کا عکس پردۂ شب میں نہاں ہوا
مشرق سے چرخ پر خطِ ابیض عیاں ہوا

تلوار

کھینچی غضب میں آ کے جو شمشیر حیدری
سب پہلوان بھول گئے اپنی صفدری
شبدیز کو اڑا کے دھنسا فوج میں جری
چمکی جو تیغ پڑ گئی لشکر میں ابتری

جبریل پر سمیٹ کے وحشت سے ہٹ گئے
سمٹی زمیں ڈر کے رسالے الٹ گئے
کھنچ کر جو تیغ تیز چلی سر اڑا گئی
تیروں کے پر کمانوں کی سینسر اڑا گئی
ہر وار میں سواروں کے محضر اڑا گئی
گر مرغ روح اُڑ کے چلا پر اڑا گئی
دم تک نہ لینے دیتی تھی ظالم کو زین پر
چو رنگ کاٹتی تھی گرا کر زمین پر
ہر سر میں مثل عقل سما کر نکل گئی
فانوس تن میں آگ لگا کر نکل گئی
شمع حیات عمر بجھا کر نکل گئی
ناری کو ہر طرح سے جلا کر نکل گئی
ہر نخل قد پہ مثل ثمر آشکار تھی
دل میں نہاں تھی گاہ کلیجے کے پار تھی
جم کر گری سروں کو اڑا کر نکل گئی
بیٹھی اٹھی جمال دکھا کر نکل گئی
بسمل کیا گلے سے لگا کر نکل گئی

ناری کو ہر طرح سے جلا کر نکل گئی
جس صف سے مل چکی وہ سفر کو روانہ تھی
معشوق کج ادا تھی بلائے زمانہ تھی

بچ کر جو اس بلا سے کوئی بد گھر چلا
تلوار نے یہ بڑھ کے صدا دی کدھر چلا
اک وار تن کے پھر جو کیا تن سے سر چلا
ہنس کر پکاری موت کہ سوئے سفر چلا
لینا نہ دم کہیں کہ خطر اس سفر میں ہے
جا جلد فوج شام کی بھرتی سفر میں ہے

جس صف پہ مثل برق چمکتی ہوئی چلی
اک آگ تھی کہ تن میں دہکتی ہوئی چلی
تن سے نکل کے روح پھڑکتی ہوئی چلی
موت اس کے ساتھ ساتھ لپکتی ہوئی چلی
ناری کو ساتھ لے گئی دوزخ میں ٹال کے
پھر آئی اس کو قعر جہنم میں ڈال کے

معرکہ جنگ

اس عرصہ میں حملے کئے مرحب نے وہاں چار
پر ایک بھی اس پنجتنی پر نہ لگا وار
آڑی ہوئی تلوار تو ظالم ہوا ناچار
بیکار ہوا اس کا ہر اک بازوئے پیکار
تب تیغ کو جھنجھلا کے رخ پاک پہ کھینچا
تھرا کے یہ اٹھا تو الف خاک پہ کھینچا

تلوار جو عاری ہوئی حضرت کی سپر سے
ظالم نے لیا خنجر ہندی کو کمر سے
خنجر تو ادھر سے چلا تلوار ادھر سے
اس وقت ہوا آنہ سکی بیچ میں ڈر سے
اسوار کے سر پر جو پڑی ہانپ کے بیٹھا
تھرا کے یہ اٹھے تو فرس کانپ کے بیٹھا

اس تیغ نے سرکش کے جو ترکش میں کیا گھر
غل تھا کہ گرا برج کبوتر میں وہ اژدر
پر تیروں کے کٹ کٹ کے گرے مثل کبوتر

ظالم ہوا مضطر صفت طائر بے پر
ناری نے نہ پھر تیر نہ تلوار سنبھالی
اک ہاتھ سے سر ایک سے دستار سنبھالی

اک وار میں اس دست ستمگار نے کاٹا
خود و زرہ و بکتر خونخوار کو کاٹا
پرزے کئے اسوار کے رہوار کو کاٹا
اک شور ہوا نور سے کیا نار کو کاٹا
خرمن پہ جفاکار کے کیا آگئی بجلی
یہ کوندی کہ بے پیر کو بس کھا گئی بجلی

بجلی گری بجلی پہ اجل آئی اجل پر
اک زلزلہ طاری ہوا گردوں کے محل پر
سیارے ہٹے کر کے نظر تیغ کے پھل پر
مریخ گرا شمس پہ اور شمس زحل پر
چہرہ نہ کیا سامنے سورج کی چمک نے
خود دانتوں سے تاروں کے زمیں پکڑی فلک نے

غازی نے کہا بس اسی فن پر تجھے تھا ناز
سیکھا نہ یداللہیوں سے جنگ کا انداز

پھر کھینچی اس انداز سے تیغ شرر انداز
جو میاں کے بھی منہ سے ذرا نکلی نہ آواز
خود و زرہ و بکتر خونخوار کو کاٹا
پرزے کیے اسوار کے رہوار کو کاٹا

خنجر کو جو کاٹا تو نہ ٹھہری وہ تبر پر
ٹھہری نہ سپر پر تو وہ سیدھی گئی سر پر
سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر
تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر
تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی دامن زیں پر
تھی دامن زیں پر تو نہ گھوڑا تھا زمیں پر

دو کٹتی ہوئی گردن بے کیش سے نکلی
ارواح صفت جسم بد اندیش سے نکلی
مچھلی کی طرح بازوے دلریش سے نکلی
آڑی کبھی ہو ہو کے پس و پیش سے نکلی
دم سینے میں کافر کے رکا اور یہ الگ تھی
دو ہو کے وہ دو سمت لڑا اور یہ الگ تھی
اس صف پہ گری تیغ سمٹ کر اسے مارا

سیدھی گری اس پر الٹ کر اُسے مارا
ہٹ کر اسے مارا تو پلٹ کر اُسے مارا
بڑھ کر اسے مارا کبھی گھٹ کر اسے مارا
اس درجہ صفائی کہ ذرا خون نہ بھرا تھا
یہ کاٹ کے نکلی بھی تو سر تن پہ دھرا تھا

گرمی کی شدت

تنہا کھڑے ہیں رن میں امام فلک جناب
گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب
خط غبار سے ہے یہی ابری سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں
مٹی خراب چرخ پہ ہے برج آب کی
رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی
حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی

فوارے کو نہ حوض سے گرمی میں کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی
آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش
آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوز جگر سے مردم آبی ہیں نالہ کش
نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نزدیک ہے کہ زہد کو پیلے آبرو کریں
تردامنی سے شہروں میں زہاد وضو کریں

میر انیس

میر ببر علی نام تھا۔ اور انیس تخلص کرتے تھے۔ میر مستحسن خلیق کے بیٹے میر حسن دہلوی کے پوتے اور میر ضاحک دہلوی کے پر پوتے تھے۔ جس وقت دلی اجڑ گئی تو میر حسن کا خاندان دہلی سے فیض آباد چلا آیا۔ یہ آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ میر انیس یہیں سنہ ۱۲۱۶ھ میں محلہ گلاب باڑی کے اندر پیدا ہوئے۔

میر صاحب نے ابتدائی کتابیں میر نجف علی صاحب سے فیض آباد میں پڑھیں۔ امجد علی شاہ کے زمانہ میں جب ان کے والد نے فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ بسایا ان کے ساتھ

آئے۔ یہاں انہوں نے مولوی حیدر علی صاحب سے عربی
کی پڑھائی پوری کی ؛
میر انیس نے بہتر برس کی عمر پائی اور ۲۹ شوال
سنہ ۱۲۹۲ھ کو انتقال کیا۔ سبزی منڈی میں اپنے مکان کے
اندر دفن ہوئے ؛
ان کا رنگ سانولا اور قد کچھ لمبا تھا۔ جسم ورزشی تھا
ظاہر میں زیادہ موٹے تازے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ لیکن
اصل میں سینہ چوڑا اور بازو سڈول تھے۔ ورزش برابر کرتے
تھے اور سپہ گری کے فن سے بھی واقف تھے۔ داڑھی باریک
کترواتے تھے۔ اخیر میں بڑھاپے نے کمزور کر دیا۔ لیکن ممبر
پر پہنچ کر ایک خوبصورت نوجوان معلوم ہوتے تھے۔ اور
ان کے بدن میں عجیب قوت پیدا ہو جاتی تھی ؛
ڈھیلی مہری کا پائجامہ اور بارہ کلی کا کرتہ پہنتے تھے۔
ان کا کرتہ اتنا لمبا چوڑا ہوتا تھا۔ کہ اس پر انگرکھا پہننے کی
ضرورت نہ تھی۔ کرتے کی دونوں آستیں بہت باریک چنی
جاتی تھیں۔ جو پیچھے دار ہو کر کہنیوں تک خود بخود چڑھ جاتی
تھیں۔ یہ پانچ کونوں والی ٹوپی پہنتے تھے۔ جس کے ہر کونہ

پر صراحی اور کنٹھا یا چاند بنے ہوئے تھے + سچے ریشم کے
مشروع کا پاجامہ بھی پہنا کرتے تھے + کاندھے پر لٹھے
کا ایک رومال پڑا رہتا تھا۔ ہاتھ میں جریب ہوتی تھی +
غذا بہت کم تھی۔ رات کو یخنی پیتے تھے۔ اور دن میں دودھ
میوہ وغیرہ اور سادہ گوشت کا قلیہ یا قورمہ کھایا کرتے تھے +

غدر سے پہلے انہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی +
غدر کے بعد اول نواب قاسم علی خاں کے اصرار سے عظیم
آباد گئے + پھر ایک مرتبہ سید شریف حسین خاں کے کہنے
سے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ تہور جنگ بہادر نے ان
کی بہت آؤ بھگت کی۔ سننے والوں کی مجلس میں اتنی کثرت
تھی کہ سیکڑوں لوگوں کو سننے کی حسرت رہ گئی +

شاعری تو ان کے گھر ہی کی تھی۔ اول اول ان کی
طبیعت غزل کہنے کی طرف جھکی۔ چند ہی غزلیں کہی تھیں کہ
باپ کو خبر لگی اور انہوں نے ان کو مرثیہ گوئی کی طرف لگا دیا +
جس وقت میر صاحب فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے تو
یہ اپنا تخلص حزیں کرتے تھے + لکھنؤ آکر ان کی شاعری کی
مشق بڑھی اور تھوڑے ہی دنوں میں کہاں سے کہاں

پہنچ گئے ۔ لکھنؤ ان کی شہرت سے گونج اٹھا + اس زمانہ میں مرزا دبیر کا بہت شہرہ تھا ۔ ان دونوں میں خوب خوب معرکے رہے +

ان کا کلام پانچ جلدوں میں چھپا ہے ۔ ابتدائی مشق میں وہ پرانے محاورے جو اس زمانے میں بولے جاتے تھے ۔ اور دوسرے شاعروں کے کلام میں پائے جاتے تھے ۔ ان کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ پھر جتنا زمانہ گزر گیا ۔ ان لفظوں اور ترکیبوں کو چھوڑتے گئے +

میر صاحب کی شاعری جس طرح اپنا جواب نہ رکھتی تھی ۔ اسی طرح ان کا پڑھنا بھی بے مثل تھا + ان کا قاعدہ تھا کہ پڑھنے سے پہلے کسی الگ جگہ پر آئینہ سامنے رکھ کر پڑھنے کی مشق کیا کرتے تھے اور ہاتھ چلا کر اپنے بدن کی حرکتوں کو دیکھتے اور ان کو درست کرتے تھے +

ان کی زبان میں دہلی کی خصوصیات اکثر پائی جاتی ہیں انہوں نے مرثیوں میں جہاں واقعات اور کیفیتوں کی تصویر کھینچی ہے ۔ وہاں اپنی شاعری کی تمام خصوصیتوں کو قائم رکھا ہے + میر صاحب نے اپنے کلام میں دوسرے تمام

شاعروں سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور سیکڑوں مختلف واقعے بیان کئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے کلام میں غیر فصیح الفاظ بہت ہی کم پائے جاتے ہیں + اکثر جگہ عربی فارسی کے وہ لفظ جو اردو میں ہل مل گئے ہیں۔ ضرورت سے مجبور ہو کر لائے ہیں + اگرچہ میر صاحب کو واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ذرا ذرا سے حالات کو بیان کرنا پڑا ہے۔ لیکن یہ بہت بڑی بات ہے کہ ان کی شاعری میں گری ہوئی اور فضول باتیں نہیں آنے پائیں + ان کے کلام میں اکثر وہی ترتیب پائی جاتی ہے۔ جو نثر میں ہوتی ہے + یہی وجہ ہے کہ ان کا شعر زیادہ صاف۔ برجستہ اور ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ اردو میں غالبًا یہ صفت انیس کے سوا کسی اور شاعر میں اتنی نہیں پائی جاتی ان کے کلام میں روزمرہ اور محاوروں کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے +

انہوں نے مرثیوں کے علاوہ سلام اور رباعیاں بھی کہی ہیں اور خوب کہی ہیں +

نمونہ ملاحظہ ہو :-

گھوڑے کی تعریف

آہو کی آنکھ شیر کی چتون غضب کی چال
وہ یال تھی کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال
گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال
پوچھے کوئی سوار سے شائستگی کا حال
اڑ کر زمیں تلک کبھی گرد قدم گئی
جب بس کہا چمکتی ہوئی برق تھم گئی

جرأت میں رشک شیر تو ہیکل میں پیلتن
پوئی کے وقت کبک دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آنے جانے میں طاوس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

پیکاں ہیں یا کنوتیاں ہنگام دار و گیر
حلقے سے یوں نکلتا ہے جیسے کماں سے تیر
روئیں وہ نرم جلد وہ باریک دبلے نظیر

چیتی پرند جس سے مقابل نہ ہو حمید
ایسی سبک روی نہیں دیکھی شتاب میں
دوڑے تو ذرق آئے نہ نعل کے خواب میں

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام
خوش رو و خوش جمال و دادا نہم و تیز گام
جاں دار و شوخ چشم و سعید و خجستہ کام
گل پوش تیز ہوش سمن گوش لالہ فام
غازی تھا سرفراز تھا عالی دماغ تھا
گویا ہوا کے دوش پہ اک زندہ باغ تھا

پالا ایاں تھی بیش بھی غربت بھی جنگ بھی
یاد تھی براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی
پریں اس بھی تھا یہیں رنگ بھی
گھوڑا بھی شیر تر بھی ہرن بھی پلنگ بھی
ہے آگ کا مزاج تو سرعت ہوا کی ہے
اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہے

گھوڑا

رہوار سبک سیر نسیم سحری تھا
ہم پیکر طاؤس دم جلوہ گری تھا
تن تن کے اٹھانے میں قدم کبک دری تھا
کاوے میں جو پر کار تو اڑنے میں پری تھا
رفتار تو کب اپنی دکھاتا وہ کسی کو
سایہ بھی نہ اس کا نظر آتا تھا کسی کو
غصے میں وہ تن تن کے دہانے کو چبانا
اور جوش شجاعت میں کف منہ سے گرانا
ہر صف میں کبھی جھوم کے آنا کبھی جانا
تلوار کی زد سے کبھی آقا کو بچانا
ٹاپوں سے دہلتی تھی زمیں حشر بپا تھا
اس صف میں جو بجلی تھا تو اس صف میں ہوا تھا

گھوڑا

نازک مزاج نسترن اندام تیز رو

گردوں مسیر باد پیما و برق دو
اس کا نہ اک قدم نہ زغندیں ہرن کی سو
دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے نہ جو
رفتار میں ہوا تھا اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی نہ تھی جھل بل میں فرق تھا

سمٹا - جما - اڑا - اِدھر آیا اُدھر گیا
چمکا - پھرا - جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو پرے سے گزر گیا
گھوڑوں کا ناک بھی ٹاپ سے اس کے فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند
سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند
نازک مزاج و شوخ و سیہ چشم سربلند
گر ہل گئی ہوا سے ذرا باگ اُڑ گیا
پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال
کبک دری خجل دل طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال
اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد برد تھا
چھل بل غضب کے تھے کہ چھلاوہ بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا
آیا عرق تو ابر گہر بار بن گیا
گہ قطب گاہ گنبد دوار بن گیا
نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اس گشت پہ لوگ اس ہجوم کے
تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

تلوار

جلوہ کیا بدلی سے نکل کر مہ نو نے
دکھلائے ہوا میں دو سر اک شمع کی لو نے
تڑپا دیا بجلی کو فرس کی تگ و دو نے

تا کا سپر مہر کو شمشیر کی ضو نے

اعدا تو چھپانے لگے ڈھالوں میں سروں کو

جبریل نے اونچا کیا گھبرا کے پروں کو

بجلی سی جو گر کر صف کفار سے نکلی

آواز بزن تیغ کی جھنکار سے نکلی

گہ ڈھال میں ڈوبی کبھی تلوار سے نکلی

در آئی جو پیکاں میں تو سوفار سے نکلی

تھے بند خطا کاروں پہ در امن و اماں کے

چلّے بھی چھپے جاتے تھے گوشوں میں کماں کے

افلاک پہ چمکی کبھی سر پر کبھی آئی

کوندی کبھی جوشن پہ سپر پر کبھی آئی

گر پھر گئی سینہ پہ جگر پر کبھی آئی

تڑپی کبھی پہلو پہ کمر پر کبھی آئی

طے کر کے پھری کونسا قصہ تھا فرس کا

باقی تھا جو کچھ کاٹ وہ حصہ تھا فرس کا

بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی

ندی اُدھر اک خوں کی اُبلتی ہوئی آئی

دم بھر میں وہ سو رنگ بدلتی ہوئی آئی
پی پی کے لہو لعل اگلتی ہوئی آئی
سبزہ تھا بدن - رنگ زمرد سے کھرا تھا
جوہر نہ کہو پیٹ جواہر سے بھرا تھا

تلوار

جس مورچے میں لیلی تیغ دو سر گئی
چنگے بھلوں کو سایہ سے دیوانہ کر گئی
ہر صف کی خاک اڑاتی اِدھر سے اُدھر گئی
پھر یہ نہا نہا کے لہو میں نکھر گئی
عالم نہ پوچھو قطرہ فشانی کے حسن کا
جوبن ٹپک رہا تھا جوانی کے حسن کا
آگے کبھی بڑھی کبھی پیچھے کو پھر مڑی
سر پر جو لڑکھڑاتی تو شانوں پہ گر پڑی
تجویز جو لعینوں نے کی وہ مضر پڑی
اُفتاد اُن سے پوچھیے یہ جن کے سر پڑی
اٹھی - گری - بلند ہوئی پست ہو گئی

پی پی کے میکشوں کا لہو مست ہو گئی
چھائی جو سر پہ شامیوں کے رات ہو گئی
ان کی زمین پردۂ ظلمات ہو گئی
برسا وہ مینہ سروں کا کہ برسات ہو گئی
معجز نمائی اس کے لئے بات ہو گئی
تاثیر چشم زخم بدوں کو دکھا گئی
شل نظر بدن کو لگی اور کھا گئی
بنرے تنے تو اس نے کہا دیکھے بھالے ہیں
بچتی نہ خنجروں سے کہ گودی کے پالے ہیں
برسے جو تیر سمجھے کمانوں کے نالے ہیں
اٹھے جو گرز بولی کہ منہ کے نوالے ہیں
ننگ اپنا جان کر نہ کسی سے بگڑتی تھی
ہر پھر کے آپ اپنی طبیعت سے لڑتی تھی

ظہور صبح

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح
گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح

کرنے لگا فلک از انجم نثار صبح
سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گزار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا
چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دمبدم
مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا
وہ صبح نور اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار
کو کو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
ور تھے در یچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے
آمد وہ آفتاب کی وہ صبح کا سماں

تھا جس کی ضد سے وجد میں طاؤس آسماں
ذروں کی روشنی میں ستاروں کا تھا گماں
نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں
ہر نخل پر ضیائے سر کوہ طور تھی
گویا فلک سے بارش باران نور تھی

ظہور صبح

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے روح طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے
ٹھنڈی ہوا وہ سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا وہ پھولوں کی دہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ چمک

ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے
وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دراج کبک تیتر و طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوشنوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبد گلفروش تھے
وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زہر گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے
وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کوکو کا شور نالہ حق سرہ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم

جاری تھے وہ جو اس کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

گرمی کی شدّت

وہ لُوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھیر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب وتب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامن سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافور صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبد چرخ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کرۂ زمہریر میں

شیر اٹھتے تھے نہ خوف کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی

ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

ہنگامہ جنگ

گرتی تھی برق تیغ جو ہر پل اِدھر اُدھر
سمٹے ہوئے تھے ڈھالوں کے بادل اِدھر اُدھر
شب دیز تھا کہ پھر رہی تھی کل اِدھر اُدھر
بھاگڑ تھی قلب فوج میں ہلچل اِدھر اُدھر
ہر جا تنوں کے ڈھیر سروں سے بلند تھے
بھاگیں کہاں گریز کے کوچے تو بند تھے

تیغیں سپر کے ساتھ کٹیں خود سر کے ساتھ
سینہ کمر کے ساتھ کٹا دل جگر کے ساتھ
ہلچل یہ تھی کہ باپ نہ ٹھیرا پسر کے ساتھ
اس معرکہ میں چھوٹ گئے عمر بھر کے ساتھ
بھاگے شریر خلعت منصب کو چھوڑ کر
جانیں روانہ ہو گئیں قالب کو چھوڑ کر

سرسنگ شام ٹھوکریں کھا کھا کے مر گئے
جو بچ گئے اِدھر سے اُدھر جا کے مر گئے

کتنے جواں سموں کے تلے آ کے مر گئے
پس پس کے سرمہ ہو گئے ٹکرا کے مر گئے
ہلچل نے استخواں بدن چور کر دیئے
بیٹوں نے پاؤں باپ کی چھاتی پہ دھر دئیے
تھا الاماں کا شور پریشاں تھے اہل شر
تیغوں کے پیچھے ڈر کے چھپی تھی ہر اک سپر
ماتھے علم رگڑتے تھے جھک جھک کے خاک پر
پرچم نے بال کھولے تھے فریادیوں نے سر
دانتوں میں خس ہراس سے تھے ہر جوان کے
چادر ہلا رہے تھے پھریرے نشان کے
بے رخ کمانیں تیروں سے ۔ چلے کماں سے دور
مرغان تیر سہمے ہوئے آشیاں سے دور
برچھی سے پھل گرے ہوئے نیزے سناں سے دور
پیروں سے عقل دور تہور جواں سے دور
تیغوں کی کچھ خبر تھی نہ ڈھالوں کا ہوش تھا
نیزہ ہر اک سوار کو اک بار دوش تھا
در پلے تھی سرکشوں کی جو وہ تیغ جانستاں

گولوں سے تھی بلند صدائے اماں اماں
ترکش سے تیر بھاگتے تھے۔ تیر سے کماں
گردن سے سر رگوں سے ہوا اور تنوں سے جاں
بارا عقاب تیر کو پروانہ کا نہ تھا
ان میں کہیں نشان قدر انداز کا نہ تھا

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں
چلّے کہیں تھے شست کہیں تھی کماں کہیں
نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں تھی سناں کہیں
جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں
اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اس کی چمک دمک
کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک
شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک
ہر ضرب میں سما سے تلاطم تھا تا سمک
کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاو زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

سکا۔ کہ ان کی تعلیم کہاں تک تھی۔ لیکن مثنوی کو دیکھ کر اتنا پتہ چلتا ہے کہ شاعری کی ضرورتوں سے واقف تھے۔ شاعری میں آتش کے شاگرد تھے اور ناسخ۔ صبا۔ رند کے ہمعصر۔

۳۲ سال کی عمر پائی۔ ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

اردو میں ان کی ایک مثنوی گلزار نسیم ہے۔ جو مثنوی میر حسن کی شہرت ہونے پر لکھی گئی۔ اس مثنوی کی نسبت جو بات زیادہ مشہور ہے۔ وہ اس کا اختصار ہے۔ لفظی رعایت کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے اور پوری مثنوی استعاروں اور کنایوں کا طلسم بنی ہوئی ہے۔ کلام کی آرائش اور زبان کی پاکیزگی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

مثنوی

گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا ۔۔۔ اور غنچہ صبح کھل کھلایا

وہ سبزہ باغ خواب آرام ۔۔۔ یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے ۔۔۔ اٹھی نگہت سی فرش گل سے

منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پر آب وہ چشم حوض پائی

دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے — کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے

گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل — جھنجھلا سے کہ کون دے گیا جل

ہے ہے مرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون

ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے — بو ہو کے تو گل اڑا نہیں ہے

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون — بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون

شبنم کے سوا چرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا

جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے

آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا — پتلی وہی چشم حوض کا تھا

گلچیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا — غنچہ کے کبھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا

او خار پڑا نہ تیرا چنگل — مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل

او باد صبا ہوا نہ بتلا — خوشبو ہی سنگھا پتہ نہ بتلا

بلبل تو چہک اگر خبر ہے — گل تو ہی مہک سنگھا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام — تھی سبزہ سی راست مو براندام

جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا — جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا

رنگ اس کا غرض لگا بدلنے — گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

گل کا سا لہو بھرا گریباں — سبزہ کا سا تار تار داماں

ڈر ڈر کے پچھلے پاؤں سپاہ لعیں ہٹی
یہ صف سوئے یسار وہ سوئے یمیں ہٹی
سہمے جبال - نہر کہیں سے کہیں ہٹی
دہشت سے آسماں ہوا اونچا زمیں ہٹی
بھاگڑ پڑی کہ ایک سے اک آگے بڑھ گیا
دریا لہو کا کشتی گردوں پہ چڑھ گیا

نعرہ جدا صدائے بگیر و بدہ جدا
گوشے کماں سے دور تھے گوشوں سے زہ جدا
بکتر جدا زمیں پہ ٹکڑے زرہ جدا
نیزوں کو دیکھئے تو گرہ سے گرہ جدا
اللہ رے فرق گردن و سر بھی بہم نہ تھے
کشتوں کا ذکر کیا ہے کہ تیغوں میں دم نہ تھے

مغفر نہ سر کے پاس نہ خنجر کمر کے پاس
بیٹے کے پاس باپ نہ بیٹا پدر کے پاس
قبضہ کے پاس تیغ نہ دستہ تبر کے پاس
کڑیاں زرہ کے پاس نہ دامن سپر کے پاس
نیزے نہ تھے سناں پہ نہ پرچم نشان پر

پیکاں نہ تیر پر تھا نہ چلہ کمان پر

معرکہ جنگ

تولا شفقی نے سنتے ہی یہ گرز گاؤ سر
اکبر نے دوش پاک سے لی ہاتھ میں سپر
آیا اُدھر سے گرز اِدھر سے چلا تبر
دو ہو گیا عمود مثال خیار تر
گرز اس طرح نکل گیا نیچے سے چھوٹ کے
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے
بھالا سنبھالا دشمن ایماں نے مل کے ہاتھ
نیزے کے چار پانچ نکالے سنبھل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ
کم تھے نہ یہ بھی زور میں گر وہ زیاد تھا
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا
رکھ کر تبر نیام سے لی تیغ شعلہ در
ٹھرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الخلا

بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
یہ بھی اِدھر سے تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر
جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
دیکھا جو غور سے توسناں کی زباں نہ تھی

بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
کھولے تمام نیزہ بیدادگر نے بند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجھلا کے پھر کمند
سر کو بچا کے شبیر نے تلوار کی بلند
گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ ہٹ گئے
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے

ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر
تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
سرکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر
چلہ کٹا کماں کا نہ رہے تیغ بے نظیر
قربان زور ضربت نصرت نشاں کے
کھل کر قفا پہ بندھ گئے بازو کماں کے

خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کماں

نیزہ اٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
شمشیر ادھر اٹھی تھی کہ چمکی اُدھر سناں
بھالے کی نوک جھونک تنی تھی نئی تکاں
سہما یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پر

رباعیاں

پُتلی کی طرح نظر میں منظور ہے تو
آنکھیں جسے ڈھونڈتی ہیں وہ نور ہے تو
ہے قرب رگ جاں سے اسپر بہ بود
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے
جاگو جاگو کہ خوف اسی راہ میں ہے
اٹھو اٹھو یہ خواب غفلت کب تک
دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

اب خواب سے چونک وقت بیداری ہے
بیلے زرد سفر کوچ کی تیاری ہے

مرمر کے پہنچتے ہیں مسافر واں تک
یہ قبر کی منزل بھی بہت بھاری ہے

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیونکر نہ لپٹ کے سوؤں اے قبر
میں نے بھی جان دے کے پایا ہے تجھے

رتبہ جسے دینا ہے خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفان ہے
مانند حباب ہستی انساں ہے
لنگر ہے جو دل تو نفس باد مراد
سینہ کشتی ہے نا خدا ایمان ہے



نسیم لکھنوی

پنڈت دیا شنکر نام تھا نسیم تخلص کرتے تھے + یہ کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تھے + ان کے باپ دادا اودھ کی سرکار میں ملازم تھے اور فوج کی تنخواہ بانٹا کرتے تھے + یہ بھی اسی سرکار کے نوکر تھے - ان کا یہی آمدنی کا ذریعہ تھا اور اسی میں ساری عمر آرام اور چین سے گزار دی + کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا +

قد ٹھگنا اور چہرہ کا رنگ گندمی تھا - آنکھیں کالی اور بدن چھریرا + مزاج میں بانکپن زیادہ تھا - طبیعت خاص طور سے شاعری کے لئے موزوں پائی تھی + یہ نہ معلوم ہو

ان کو بہت عزیز رکھتے تھے - ان کو دربار سے پانسو روپے ماہوار ملتا تھا اور انعام و اکرام بھی دیتے رہتے تھے۔

ان کی تاریخ وفات کا پتہ نہیں چلا - اتنا معلوم ہے کہ یہ غدر کے زمانہ کے بعد تک زندہ تھے۔

یہ بہت عیش اور آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور بہت رنگین مزاج تھے - وہ شاعری کے دعویدار نہ تھے چنانچہ اپنے دوستوں میں صاف صاف کہہ دیا کرتے تھے کہ میں شاعر نہیں ہوں - لیکن شاعری کرتے تھے اور آتش کے شاگرد تھے۔

ان کی چار مثنویاں مشہور ہیں - زہر عشق - بہار عشق فریب عشق اور لذت عشق - یہ چاروں مثنویاں واجد علی شاہ کے زمانہ میں لکھی گئیں - ان میں سب سے زیادہ زہر عشق کو شہرت حاصل ہوئی - یہ مثنوی ۱۲۷۷ھ میں لکھی گئی۔

ان مثنویوں میں بعض مقامات تہذیب سے گرے ہوئے ہیں لیکن اگر شاعری کی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ تینوں مثنویاں میر حسن کی مثنوی "سحرالبیان" سے بڑھ کر نہیں - تو کم درجے کی بھی نہیں ہیں - ان میں نہ پڑنے

الفاظ ہیں اور نہ پرانے محاورے ان میں زبان کی گھلاوٹ روزمرہ کی صفائی اور مصرعوں کی برجستگی بہت قابل تعریف ہے۔ ان میں مردانے اور زنانے محاوروں کو نہایت بے تکلفی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اگرچہ ان مثنویوں میں سحرالبیان کی طرح ہر موقع کا سین تو نہیں دکھایا گیا لیکن ان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ ان مثنویوں میں لکھنؤ کے شاعروں کی طرح لفظی رعایتوں کا بالکل خیال نہیں کیا گیا۔ اردو کے عام روزمرہ استعمال کو صحت الفاظ پر اکثر ترجیح دی گئی ہے۔ بعض بعض جگہ ردیف قافیوں میں استادوں کے طریقے سے انحراف کیا گیا ہے۔

یہ مثنویاں کچھ مدت تک سرکاری حکم سے چھپنا بند ہو گئی تھیں لیکن قلمی نسخے اکثر لوگوں کے پاس پائے جاتے تھے۔ اور مثنوی زہر عشق کا وہ حصہ جس میں مصنف نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا رہا اور عام طور سے لوگوں کی زبانوں پر چڑھا رہا۔ اب یہ مثنویاں پھر چھپنے لگی ہیں۔ اور بازار میں بہت سے نسخے

ملتے ہیں ٭

زہر عشق اپنے واقعہ کے لحاظ سے بہت دلگداز واقع ہوئی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سچا واقعہ ہے۔ اسی طرح فریب عشق اور بہار عشق میں بھی واقعات ہی نظم کئے گئے ہیں۔ لذت عشق ایک فرضی قصہ ہے۔ جو مثنوی سحر البیان کی طرز پر نظم کیا گیا ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ لذت عشق مرزا شوق کی لکھی ہوئی نہیں۔ یونہی ان کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے ٭

نمونہ:۔

مثنوی

جائے عبرت سرائے فانی ہے — مورد مرگ نوجوانی ہے
اونچے اونچے مکاں تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانہ بوم
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو — صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج جو ڈھونڈو نہ ہیں مکاں باقی — نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرت حور مہ جبیں نہ رہے | ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم | ہو گئے جا جا کے زیر خاک مقیم
کوئی لیتا بھی اب نہیں یہ نام | کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے | اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج | آج وہ فاتحہ کو ہیں محتاج
تھے جو خود سر جہان میں مشہور | خاک میں مل گیا سب انکا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے | نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے | استخواں تک بھی انکے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور | باقی ان کا نہیں نشاں قبور
تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر | ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسین | کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے | یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتہ | نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ
بوئے الفت تمام پھیلی ہے | باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائران خوش الحان | پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

رنج کرنا نہ میرا میں قرباں ۔۔۔ سن لو اپنی جان ہے تو جہاں
دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو ۔۔۔ جان دینا نہ گھونٹ گھونٹ کے تو
آ کے رو لینا میری قبر کے پاس ۔۔۔ تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
آنسو چپکے سے دو بہا لینا ۔۔۔ قبر میری گلے لگا لینا
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر ۔۔۔ پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا ۔۔۔ پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
رو کے کرنا نہ اپنا حال زبوں ۔۔۔ یوں نہ ہو جائے دشمنوں کو جنوں
میرے مرقد پہ روز آنا تم ۔۔۔ فاتحہ سے نہ ہاتھ اٹھانا تم
ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے ۔۔۔ مٹی دینا تم اپنے ہاتھوں سے
دل پہ کچھ آنے دیجیو نہ ملال ۔۔۔ خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
رنج و راحت جہاں میں توام ہے ۔۔۔ کبھی شادی ہے اور کبھی غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ ۔۔۔ ہے کسی جا صدائے نالہ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں ۔۔۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو ۔۔۔ آج دل کھول کر گلے مل لو
حشر تک پھر یہ ہوگی بات کہاں ۔۔۔ ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں
خاک میں ملتی ہے یہ صورت عیش ۔۔۔ پھر کہاں ہم کہاں محبت عیش
ختم ہوتی ہے زندگانی آج ۔۔۔ خاک میں ملتی ہے جوانی آج

چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن
ایک بچھڑے ملیں گے حشر کے دن

آگے آگے ہے کچھ جلوس رواں
سر کھلے پیچھے پیچھے پیر و جواں

سن رسیدہ ہیں عورتیں کچھ ساتھ
سینہ و سر پہ مارتی ہیں ہاتھ

کوئی ماما ہے کوئی دائی ہے
کوئی انّا کوئی کھلائی ہے

جب وہ بھرتی ہیں غم سے آہ سرد
سننے والوں کے دل میں ہوتا ہے درد

ہوتا ہے غیروں کو ملال ان کا
دیکھا جاتا نہیں ہے حال ان کا

اس کے پیچھے پڑی اس پہ نگاہ
کہ نہ دیکھے کبھی بشر معاذ اللہ

تھی پڑی اس پہ ایک چادر گل
جس سے خوشبو وہ راہ تھی بالکل

بھیڑ تابوت کے تھی ایسی سات
جیسے آئے کسی دلہن کی برات

سب وضیع و شریف تھے ہمراہ
بھیڑ تھی اس قدر کہ بند تھی راہ

پیچھے پیچھے تھا سب کے سوداگر
مو پریشاں اداس خاک بسر

آگے آگے جنازہ جاتا تھا
غش اسے ہر قدم پہ آتا تھا

ہاتھ تھامے تھے اقربا سارے
تا کسی جا پہ سر نہ دے مارے

حال اس درجہ ہو رہا تھا زبوں
بہتا جاتا تھا سر کے زخم سے خوں

سب امیر و فقیر روتے تھے
دیکھ کر راہ گیر روتے تھے

پیچھے سب کے قفس میں تھی مادر
کہتی جاتی تھی اس طرح رو کر

دکھلا کے کہا سمن پری کو | اب چین کہاں بکاؤلی کو
تھی بسکہ غبار سے بھری وہ | آندھی سی اٹھی ہوا ہوئی وہ
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ | ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ
جس غنچہ میں مثل باد جاتی | اس رنگ سے گل کی بو نہ پاتی

بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے
پتا کہیں حکم بن ہلا ہے

شوق لکھنوی

ان کا اصلی نام حکیم تصدق حسین خاں تھا اور عرف نواب مرزا۔ شوق تخلص کرتے تھے۔ ان کے باپ کا نام مرزا آغا علی خاں لکھنوی تھا۔

ان کے چچا حکیم الملک مرزا علی خاں اودھ کے دربار میں بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ اور بہت بڑے حکیم گنے جاتے تھے۔

نواب مرزا ایک پڑھے لکھے آدمی تھے۔ طبابت میں ان کو بہت مہارت تھی۔ اودھ کے اخیری بادشاہ واجد علی شاہ کے زمانہ میں ان کی پہنچ دربار تک ہوئی۔ واجد علی شاہ

تیری میت پہ ہو گئی میں نثار — کم سخن ہائے میری غیرت دار
کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو — کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو
دل پہ جو گزری کچھ بیان نہ کی — کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی
دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں — بیٹا اس ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں
تازہ پیدا جگر کا داغ ہوا — گھر مرا آج بے چراغ ہوا
دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے — جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے
زہر دیدو کوئی میں کھا جاؤں — یا زمیں شق ہو میں سما جاؤں
داغ تیرا جگر جلاتا ہے — چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے
مٹ گیا لطف زندگانی کا — دل کو غم ہے تری جوانی کا
بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں — کوئی منت بڑھانے پائی نہ میں
تیری صورت کے ہو گئی قربان — چلیں دنیا سے کیسی پُر ارماں
ہوئیں کس بات پر خفا بولو — اماں واری ذرا جواب تو دو
بولتی تم نہیں پکارے سے — اب جیوں گی میں کس سہارے سے
کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا — آج گھر میرا بے چراغ کیا
نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارماں — ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پروان
ایسی اس ماں سے ہو گئیں بیزار — لی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار
نہ جیوں گی تیرے فراق میں میں — دل تڑپتا ہے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں

کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا   کوکھ میری اُجڑ گئی بیٹا

عمر کٹنی تھی ایسے صدمہ میں

ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

امانت

سیّد آغا حسن نام تھا اور امانت تخلص۔ میر آغا رضوی لکھنوی کے بیٹے تھے۔ جو مشہد مقدس کے روضہ کے کلید بردار تھے۔ ان کی پیدائش ۱۲۳۱ھ میں ہوئی۔

اول اول انہیں مرثیہ کہنے کا شوق ہوا۔ اس زمانہ میں دلگیر مرثیہ کہنے والوں میں زیادہ مشہور تھے۔ امانت انہی کے شاگرد ہوئے۔ چند روز بعد غزل کہنے کی طرف توجہ کی۔ میاں دلگیر نے غزل پر اصلاح دینے سے انکار کیا۔ تو انہوں نے اصلاح لینا چھوڑ دی۔

بیس برس کی عمر تھی۔ کہ کسی عارضہ کی وجہ سے ان

کی زبان بند ہو گئی۔ علاج کرنے سے اچھے ہو گئے۔ لیکن زبان میں ہکلا پن باقی رہ گیا۔

شاعری میں معمے اور چیستاں کا بہت شوق تھا۔ ان کی تصنیفوں میں خزائن الفصاحت۔ گلدستہ امانت۔ اندر سبھا اور اکثر مرثیے چھپ چکے ہیں۔ لفظی رعایت اور صنعتوں کو انتہا پر پہنچا دیا ہے۔ اس لئے ان کا کلام ضلع جگت کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔

ان کی دو تصنیفیں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک واسوخت اور دوسری اندر سبھا۔ واسوخت کی شہرت محض لفظی رعایتوں کے باعث امید سے زیادہ ہوئی۔ اندر سبھا ۱۲۷۰ھ میں ترتیب دی گئی۔ اس میں کثرت سے ایسے اشعار ہیں۔ جن میں لفظوں کی شان۔ بندش کی چستی۔ طبیعت کا زور۔ استعاروں کی نزاکت تشبیہوں کی پختگی اور خیال کی بلندی بہت زیادہ ہے۔ اندر سبھا میں بعض غزلیں نئی زمینوں میں کہی گئی ہیں۔ ایسی سلجھی ہوئی زبان لکھی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی اس زمانہ کا لکھنوی لکھ رہا ہے محاورے بھی ایسے ملیں گے۔ جو آج تک بولے جاتے ہیں۔

زبان کی خوبیوں کے علاوہ موسیقی کے لحاظ سے بھی یہ ڈرامہ بہت دلچسپ ہے۔ اس میں ہولی۔ ٹھمری۔ ملار۔ ساون بسنت۔ غزل۔ چوبولہ ہر قسم کی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ اس کے گانوں میں راگ راگنیوں کا ایک بڑا حصہ آجاتا ہے۔

اندر سبھا کا پلاٹ یہ ہے کہ راجہ اندر اپنی سبھا لگاتا ہے۔ پکھراج پری۔ نیلم پری اور لال پری باری باری آکر ناچتی گاتی ہیں۔ اخیر میں سبز پری آتی ہے۔ لیکن راجہ اندر سو جاتے ہیں۔ اور محفل برخاست ہو جاتی ہے۔ اب سبز پری کالے دیو سے کہتی ہے۔ کہ میرا دل ہندوستان کے شہزادے گلفام پر آگیا ہے۔ تو اسے جاکر اٹھا لا۔ کالا دیو گلفام کو لاتا ہے۔ سبز پری اسے جگاتی ہے۔ اور اپنی محبت اس پر ظاہر کرتی ہے۔ شہزادہ اول اول تو بہت جلی کٹی سناتا ہے۔ لیکن اخیر میں اس شرط پر راضی ہو جاتا ہے کہ سبز پری اُسے اندر کے اکھاڑے کی سیر کرا دے۔ اول اول تو سبز پری اس کو سمجھاتی ہے اور اپنی دشواریاں ظاہر کر کے اس کی ضد کو دور کرنا چاہتی ہے۔ جب وہ نہیں مانتا تو یہ شہزادے کو لے جاکر ایک

درخت کی آڑ میں چھپا دیتی ہے اور خود اندر کی سبھا میں ناچنے گانے لگتی ہے۔ اتنے میں لال دیو شہزادہ کو دیکھ کر راجہ اندر کو خبر کر دیتا ہے۔ راجا گلفام کو قید خانے میں بھیج دیتا ہے اور سبز پری کے پر نوچ کر اس کو اکھاڑے سے نکال دیتا ہے۔

سبز پری جوگن بن کر پھر پرستاں میں آتی ہے۔ اور گلفام کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ اتفاق سے ایک دن کالا دیو اس کا گانا سن کر راجا کو اطلاع دیتا ہے۔ یہ بلائی جاتی ہے۔ یہ آکر ایسا گانا گاتی ہے کہ راجا خوش ہو جاتا ہے۔ اول گلوری اور پھر گلے کا ہار اور اس کے بعد شال انعام میں دیتا ہے۔ وہ ان سب کو واپس کر دیتی ہے۔ اور راجا سے کہتی ہے۔ کہ مجھے منہ مانگا انعام دیا جائے راجہ اقرار کرتا ہے۔ پری گلفام کو مانگتی ہے اور راجہ اقرار کے مطابق گلفام کو سبز پری کے حوالے کر دیتا ہے۔

سبز پری اور گلفام ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتا ہے۔ سب پریاں مل کر مبارکباد گاتی ہیں اور کھیل ختم ہو جاتا ہے۔

واسوخت کا نمونہ :۔

واسوخت

عشق کے حال سے یارب کوئی آگاہ نہ ہو
پاؤں اس راہ میں رکھ کر کوئی گمراہ نہ ہو
غرق بحر غم و اندوہ میں دل آہ نہ ہو
حسن یوسف بھی نظر آئے تو کچھ چاہ نہ ہو
مثل ہاروت اسیر چہ بابل ہووے
دل مگر زہرہ جبینوں پہ نہ مائل ہووے

عشق وہ گل ہے کہ دامن میں ہیں جس کے سوخار
عشق وہ نخل ہے جس میں نہ لگا پھل اکبار
عشق وہ میوہ ہے جس میں نہیں لذت زنہار
عشق وہ باغ ہے جس میں کبھی آئی نہ بہار
عشق وہ شاخ ہے جس میں نہیں پتہ دیکھا
عشق وہ غنچہ ہے جس کو نہ شگفتہ دیکھا

چمن دہر میں وہ سبز قدم ہے یہ شجر
خشک ہو سبزۂ تر سایہ میں جس کے یکسر

گرم رفتار ہو گلشن میں ہوا اس کی اگر
سرو گلزار بنے سرد چراغاں جل کر
طرف روشوں کے اگر رخ کبھی اسکا ہو جائے
ہو خلش خار کو گل سوکھ کے کانٹا ہو جائے

یہ وہ گل چیں ہے کہ تاراج کرے عیش کا باغ
یہ وہ گلدستہ ہے پھولوں کے عوض جس میں ہیں داغ
یہ وہ نکہت ہے کہ بلبل کا پریشاں ہو دماغ
یہ وہ جھونکا ہے کہ جو زیست کا گل کردے چراغ
سرد اس باد سے گلزار کا مطبخ ہو جائے
اوس شبنم پہ پڑے آتش گل یخ ہو جائے

یہ وہ محفل ہے کہ راحت کا نہیں جس میں گزر
بار لے قلیاں دھواں آہ کا ہے ہر لب پر
یہ وہ صحبت ہے کہ ہے پان جہاں خون جگر
یہ وہ مجلس ہے کہ پانی کی ہے جا دیدۂ تر
یہ وہ ہے دور کہ ہشیار بھی متوالے ہیں
یہ وہ جلسہ ہے کہ مطرب کے عوض نالے ہیں
سب ہیں اسباب پر آسیب محبت ہے غضب

بھوت بن جاتا ہے عاشق نہیں بنتا کسی ڈھب
ہوتا ہے سایہ فگن دیو شب فرقت جب
تب یہ چلاتا ہے انساں کہ بنی جان پہ اب
جن کو دعوئے ہے دم انکا بھی فنا ہوتا ہے
حسن پریوں کا حقیقت میں بلا ہوتا ہے

عشق بے موت سدا رکھتا ہے عشاق کو مار
اس ستمگر کی ادا میں ہے قضا آخر کار
ہووے بیمار محبت کو جو شوق دیدار
چہرۂ یار کے نظارے کے بدلے اک بار
ملک الموت کی شکل اس کو دکھاتا ہے عشق
روزن در کے عوض گور جھنکاتا ہے عشق

جانکنی رہتی ہے دم زیست سے گھبراتا ہے
خواہش مرگ میں بیتابی سے چلاتا ہے
صدمہ اس ہجر کا عشاق کو تڑپاتا ہے
ملک الموت کے نظارے سے گھبراتا ہے
رکھے محفوظ خدا عشق کی بیماری سے
موت بہتر ہے کہیں دل کی گرفتاری سے

اندر سبھا کے نمونے :-

غزلیں

روح بدن میں ہے طپاں جی کو ہے کل سے بیکلی
جلد خبر لو ہمدلو جان فراق میں چلی

بادِ صبا جو صبح دم باغ میں ناز سے چلی
نخل نہال ہو گئے پھول گئی کلی کلی

تار کشی دوپٹہ تو اوڑھے کرن جو ٹانک کر
ہو شب ماہتاب میں کیا ہی صنم جھلا جھلی

قصہ کیا جو ابر میں اس گل تر سبز کا
سبزے نے دور تک کیا دشت میں فرش مخملی

بہکے زمیں شعر میں پاؤں امانت اپنا کیا
جب ہوئی لغزش اک ذرا نکلا زبان سے یا علی

دل کو چین اک دم نہ چرخ کہن ملنا نہیں
وہ مرا گلفام وہ گل پیرہن ملتا نہیں
کس طرف صرصر مرے گل کو اڑا کر لے گئی

گلشن عالم میں وہ رشک چمن ملتا نہیں

زندگی سے تنگ ہوں بے یار باغ دہر میں
بیکلی ہے دل کو وہ غنچہ دہن ملتا نہیں

جیتے جی جب پر مرے انساں کرے ترک لباس
بعد مُردن اُس کے ہاتھوں سے کفن ملتا نہیں

شکل طاؤس گلستاں ہوں سراپا داغدار
گل بدن پر کھائے ہیں وہ گلبدن ملتا نہیں

کانٹے تلووں میں چبھے ہیں جاکے اب ڈھونڈھوں کہاں
بیرلوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں

صورت فرہاد میں نے چھان مارے سب پہاڑ
پر کوئی اُستاد سا شیریں سخن ملتا نہیں

دل کو مرغوب ہے ٹھنڈی جو ہوا ساون کی
مانگتا ہوں میں سدا حق سے دعا ساون کی

یاد آتا ہے وہ سبزہ وہ گھٹا ساون کی
شکل دکھلائے کہیں جلد خدا ساون کی

ابر بھاگا ہوا جاتا ہے خدا خیر کرے

آج بدلی نظر آتی ہے ہوا ساون کی
ایک لحظہ نہیں تھمتی ہے جھری بُندکوں کی
لگ گئی کیا مری آنکھوں کو ہوا ساون کی
اے امانت یہ نکالی ہے زمیں تو نے نئی
پہلے تھی کس کی غزل تیرے سوا ساون کی

ٹھمری

آئی ہوں سجنا میں چھانڈ کے گھر — کا ہو کی نہیں ہے آج کھبر
چیری تیری راجہ اندر — رکھنا دن رین دیا کی
سونے کا راجے سیس مُکٹ — روپے کے تخت پر بیٹھ نڈر
چاروں کونوں پر لال لٹیں — داتا کا کرم رہے آٹھ پہر
سایہ رہے پیر پیمبر کا — مولا کی سدا رہے نیک نجر
اُستادیہ کہہ ہر سے ہر دم — دنیا میں رہیں جگت اکھتر

ساون

بن پیا گھٹا نہیں بھاوے
رو رو دل روندھو آوے — بجری کی چمک تڑپاوے ڈراوے

بن پیا گھٹا نہیں بھاوے

امنڈ گمنڈ کے کاری بدریا　　موہے ناحک نہ ستاوے

کوؤ یوں پورواٰئی سے جاکہو　　اور ملک برساوے جاوے

بن پیا گھٹا نہیں بھاوے

بھیجت ہوں آنسوں کی بوندن　　میگا جھر نہ لگاوے

پیر اُستاد کو مان کے اپنے　　بل پربت پر جاوے جاوے

ہولی

جرجاٰئے گیاں ایسی ہوری　　بن سیاں دیہہ سلگت موری

بن پیا مکھ پر مارکے تھاپر　　کھوب گاٰں ملوری

نینن کی پیچکاری بناکے　　آنسوں رنگ میں بوری

بن سیاں دیہہ سلگت موری

ٹھگ ماری یوں ٹھاڑی ہوں اُن بن　　جیسے کینی ہے چوری

کا مکھ لے اُستاد کے جاؤں　　جیا لے آچھت توری

بن سیاں دیہہ سلگت موری

رند

نواب سید محمد خاں نام۔ رند تخلص۔ نواب غیاث الدین نیشاپوری کے بیٹے تھے۔ جو اودھ کے صوبہ دار نواب برہان الملک کے سگے بھانجے تھے۔ ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۱۲ھ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ چونکہ ان کی دادی نواب سعادت علی خاں برہان الملک کی حقیقی بہن تھیں۔ اس لئے ۲۰ سال تک نواب شجاع الدولہ مرحوم کی بیوی امتہ الزہرا بیگم عرف بہو بیگم کے پاس بہت لاڈ پیار میں پرورش پائی۔ جب تک فیض آباد میں رہے۔ میرانیس کے باپ میر مستحسن خلیق سے اصلاح لیتے رہے۔ اس

زمانہ میں یہ اپنا تخلص وفا کرتے تھے - وہیں ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا +

جب بہو بیگم کا انتقال ہو گیا اور میر خلیق بھی فرخ آباد چلے گئے تو یہ رجب ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ آ گئے اور یہیں رہ پڑے + یہاں خواجہ آتش کی شاگردی اختیار کی + خواجہ صاحب نے ان کا تخلص بدل کر رند رکھ دیا +

اخیر عمر میں تمام باتوں سے توبہ کر لی - بلکہ استاد کے مرتے ہی شاعری بھی چھوڑ دی + اس زمانہ میں اودھ کے دربار میں بہت ابتری رونما ہو رہی تھی - ایک دوسرے کی اکھاڑ پچھاڑ میں گیا ہوا تھا + یہ باتیں ان کو پسند نہ آئیں اور حج اور زیارت کی نیت سے انہوں نے لکھنؤ کو چھوڑا یہ نیکی ان کی قسمت میں نہ تھی -اس لئے بمبئی پہنچ کر بیمار ہو گئے اور آخرت کا سفر اختیار کیا +

پہلا دیوان تو لکھنؤ پہنچ کر ضائع کر دیا - اس کے بعد دو دیوان اور مرتب کئے - جو "گلدستہ عشق" کے نام سے چھپ چکے ہیں + مگر ان دیوانوں میں بھی میر خلیق کا رنگ جھلکتا ہے +

ان کے کلام میں سادگی اور صفائی زیادہ ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے کلام میں زیادہ تاثیر پیدا ہو گئی ہے محاورے اور روزمرے کا استعمال ان کے گھر کی بات تھی عاشقانہ مضامین کو اچھی طرح ادا کرتے تھے۔ رازونیاز کے معاملات میں کوئی جگ بیتی کہتا ہوگا۔ یہ آپ بیتی کہتے تھے۔ لیکن ان کا بازاری مذاق نہ تھا۔ بلکہ ہر ایک مضمون نہایت تہذیب کے ساتھ دلکش لفظوں میں ادا کرتے تھے۔

کلام کا نمونہ :۔

غزلیں

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد
میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد

دکھایا کنج قفس مجھ کو آب و دانہ نے
وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

اُداس دیکھ کے مجھ کو چمن دکھاتا ہے
بہت دنوں میں ہوا ہے مزاج داں صیاد

پروں کو کھول دے ظالم جو قید کرتا ہے
قفس کو لے کے میں اُڑ جاؤں گا کہاں صیاد

قفس کو شام سے لٹکا کے فرش خواب کیا تھا
سنا کیا مری تا صبح داستاں صیاد

اجاڑا موسم گل ہی میں آشیاں میرا
الٰہی ٹوٹ پڑے تجھ پہ آسماں صیاد

الٰہی دیکھئے کیونکر تباہ ہوتا ہے
زباں دراز ہوں میں اور بد زباں صیاد

دل کو پھر کاکل میں الجھاتے ہیں ہم
سر پہ پھر روز سیہ لاتے ہیں ہم

اے اجل آ جلد خدا کے واسطے
زندگی سے اب تو گھبراتے ہیں ہم

کل کہہ آئے تھے نہ آئینگے کبھی
بن بلائے آج پھر جاتے ہیں ہم

ہم پہ بہتاں اور کی الفت کا ہے
لے ترے سر کی قسم کھاتے ہیں ہم

رند جب ملتے ہیں وہ تنہا کبھی
دوڑ کر اُن سے لپٹ جاتے ہیں ہم

مسکرا کر کہتے ہیں وہ ناز سے
بس نہیں باتوں سے گھبراتے ہیں ہم

متفرق اشعار

پھینک دوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا

تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا
ضعف اسے کہتے ہیں سینہ سے لبوں تک آتے

سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اٹھا
چھوڑا قفس سے تب ہمیں صیاد تو نے آہ

جب موسم بہار چمن سے نکل گیا
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل
پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر

چار دن اور ہوا باغ کی کھا لے بلبل
لطف گلگشت چمن کنج قفس میں بھولے

اب تو نقشہ بھی گلستاں کا مجھے یاد نہیں
کبھی خوف خزاں ہے اور کبھی صیاد کا کھٹکا

بتاؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں
وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے

کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے
چار دن کی دوستی کا ہے زمانے میں رواج

کس توقع پر کسی سے آشنائی کیجئے

پھنسائیں بلبلیں گن گن کے توڑے پھول چن چن کے
چمن میں تم نے او صیاد گلچیں کچھ بھی چھوڑا ہے

دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست
ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

وقت بد میں کون دیتا ہے کسی کا ساتھ زند
یار ثابت اک ملی دنیا میں تنہائی مجھے

خوش رہو تم وطن میں اہل وطن
ہم ہیں اور سیر دشت غربت ہے

تب کریں آرزو خدائی کی
شان ہے تیری کبریائی کی

بس اب آپ تشریف لے جائیے
جو گزرے گی ہم پر گزر جائے گی

طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

جلال

ضامن علی نام - جلال تخلص - حکیم اصغر علی داستانگو کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے - ۱۲۵۰ھ کو محلہ پار لکھنؤ میں پیدا ہوئے ۔

انہوں نے نواب آصف الدولہ کے مدرسہ میں تعلیم پائی - عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے ہی تھے کہ شاعری کا شوق پیدا ہوا - اول امیر علی خاں ہلالی کو اپنا کلام دکھاتے رہے - چونکہ طبیعت کو شاعری سے خاص لگاؤ تھا - چند ہی روز میں کیا سے کیا ہو گئے - جب ہلالی نے ان کے کلام اور اپنی اصلاح کا اندازہ کر لیا - تو خود انہیں لے جا

کر میر علی اوسط رشک کا شاگرد کرا دیا۔ کچھ عرصہ تک ان سے اصلاح لیتے رہے۔ جب وہ کربلائے معلیٰ چلے گئے تو یہ مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد رام پور چلے گئے۔ اس وقت ان کی عمر بائیس برس کی تھی۔ ان کے باپ نواب یوسف علی خاں کی سرکار میں داستانگوئی پر مقرر تھے۔ یہ بھی وہیں نوکر ہو گئے۔ ان کے بعد نواب کلب علی خاں نے بھی انکی قدردانی فرمائی۔ عرصہ تک سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا رہا۔ کئی دفعہ استعفا دے کر چلے آئے۔ نواب نے ہر دفعہ بلوایا اور کام نہ کرنے کے زمانہ کی تنخواہ بھی عنایت فرمائی۔

منگرولی کے نواب حسین میاں بھی ان کو پچیس روپے ماہوار دیتے تھے اور ہر قصیدہ پر سو روپے دیا کرتے تھے یہ مفت کسی کو بھی اصلاح نہ دیتے تھے۔

ان کو اپنی زباندانی کا بڑا دعویٰ تھا اور اس بات پر ناز تھا۔ کہ وہ محاورے غلط نہیں بولتے۔ اگرچہ وہ مغرور تھے لیکن پھر بھی اہل کمال سے جھک کر ملتے تھے۔

نواب کلب علی خاں کے مرنے کے بعد یہ پھر لکھنؤ چلے

آئے اور منصور نگر میں ایک مکان خرید کر رہنے لگے۔
چھہتر برس کی عمر پائی ۔ ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۰۹ء میں انتقال کیا۔

"سرمایہ زبان اردو" کے نام سے ایک بڑی کتاب لکھی ہے ۔ جس میں محاورے اور کنایے اور اصطلاحیں اردو زبان کی بیان کی ہیں + ایک رسالہ مفید الشعرا بھی ان کا لکھا ہوا ہے ۔ اس میں اسموں کی تذکیر و تانیث کی بحث ہے + ایک اور رسالہ قواعد المنتخب بھی ہے ۔ جس میں بعض مفرد اور مرکب لفظوں کی تحقیق کی گئی ہے + علاوہ ان کے چار دیوان بھی ہیں۔

جلال کے استاد ہونے میں کسی کو کلام نہیں ۔ علمی قابلیت کے علاوہ انہیں فن میں بھی ایک خاص رتبہ حاصل ہے + یہ شاعری کی تمام قسموں پر قدرت رکھتے تھے ۔ ہر رنگ میں ان کا کلام موجود ہے ۔ کہیں تشبیہہ ہے ۔ تو کہیں خیال گوئی ۔ کسی جگہ عاشقانہ رنگ ہے تو کہیں معاملہ بندی ہے۔

جلال ناسخ کے خاندان کی شاعری کے یادگار تھے۔

ان کے یہاں خاص لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پائی جاتی ہے*
کلام کا نمونہ یہ ہے :-

غزلیں

آج کس مست کی رخصت ہے میخانے سے
شیشہ مل مل کے بہت رونا ہے پیمانے سے

کٹ گئی پاؤں کی بیڑی جو پہن لی زنجیر
ہوشیاری کوئی سیکھے ترے دیوانے سے

دیکھ سکتا نہیں دل یار سے پہلو خالی
ہم کو معلوم ہوا آنکھ کے بھر آنے سے

نہ چھپا خون کیا ہے جو ہمارے دل کا
کھل گیا اس نگہ شوخ کے سمجھانے سے

حسرتیں دل میں نکلتی ہی چلی آتی ہیں
بستیاں ہوتی ہیں پیدا مرے ویرانے سے

اُس کے آنے کی نہ ٹھیرے گی یہ ثابت ہے جلالؔ
آپ سے آپ طبیعت کے ٹھہر جانے سے

اس سے کچھ میرا بھی ذکر اے دل ناشاد رہے
وقت پر بھول نہ جانا یہ ذرا یاد رہے

ہم سے جتنے ہی تری یاد میں برباد رہے
تو سلامت رہے کوچہ ترا آباد رہے

قہقہے خوب لگے بے اثری پر اس کی
کیا مجھے شاد کیا خوش مری فریاد رہے

گوش زد اُس بت ظالم کے نہ ہونا بہتر
نارسا یوں ہی الٰہی مری فریاد رہے

خیر بھولے نہیں وہ میری وفاؤں کو جلال
یہ غنیمت ہے کہ جور اپنے انہیں یاد رہے

متفرق اشعار

آنسو رُکے تو کیا نہیں جینے کا راز عشق
حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے

کیا تھی کسی کی ترچھی نظر کچھ نہ پوچھئے
اک تیر تھا کلیجے کے جو پار ہو گیا

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغ چمن

شگوفے دیکھیں انہیں کیا نہال کرتے ہیں

لو بند کئے بیٹھے ہیں ہم دیدۂ مشتاق

اب دیکھیں کہ آجاتے ہو تم دل میں کدھر سے

خوبرویوں کے بگڑنے میں بھی ہیں لاکھ بناؤ

کہیں اچھوں کی کوئی بات بری لگتی ہے

امیر مینائی

منشی امیر احمد نام تھا اور امیر تخلص کرتے تھے۔ مولوی کرم احمد مینائی کے بڑے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے + ان کے نسب کا سلسلہ مخدوم شاہ مینا کے خاندان سے ملتا ہے + شاہ نصیرالدین حیدر بادشاہ کے زمانہ میں ۱۶ر شعبان ۱۲۴۴ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے +

درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور اس زمانہ کے عالموں سے پڑھیں + شعر و شاعری کا شوق ہوا تو منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہو گئے۔ اور کچھ دنوں میں اپنے استاد سے بھی بڑھ گئے +

۱۲۶۹ھ میں خوش قسمتی سے واجد علی شاہ اختر بادشاہ اودھ کے دربار میں رسائی ہوئی + ارشاد السلطان اور ہدایتہ السلطان دو کتابیں لکھ کر پیش کیں اور خلعت سے سرفراز ہوئے ٭

غدر کے بعد ۱۲۷۵ھ میں نواب یوسف علی خاں نے ان کو بلوایا اور ان کی بہت قدردانی کی - یہ وہیں رہ پڑے اور ریاست کی طرف سے عدالت دیوانی کے ایک ممبر ہو گئے + ۱۲۸۱ھ میں نواب کلب علی خاں تخت پر بیٹھے اور خوش قسمتی سے امیر نواب کے استاد بن گئے ٭

نواب کی زندگی بھر رامپور میں رہے اور مزے میں رہے + نواب کے انتقال کے بعد وہ ساری باتیں جاتی رہیں - وہ صحبتیں مٹ گئیں + منشی صاحب قدردانی کی امید میں حیدرآباد دکن پہنچے - لیکن چند ہی روز بعد ۱۹ - جمادی الاول ۱۳۱۸ھ کو انتقال کر گئے ٭

امیر اور داغ اس دور میں آفتاب اور ماہتاب تھے + ایک تو مضمون نئے نئے پیدا کرنے میں کوشش کرتا تھا اور دوسرا بیان میں شوخی پیدا کرتا اور معاملہ نگاری کرتا +

امیر کے یہاں نازک خیالی کے ساتھ لفظوں کی شان و شوکت بھی پائی جاتی ہے + انہوں نے شاعری کی تمام قسموں میں طبع آزمائی کی ہے + بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظ نہایت اچھے معلوم ہوتے ہیں + یہ جتنے بوڑھے ہوتے گئے انکے کلام میں جوانی کی امنگیں بڑھتی گئیں +

ان کا پہلا دیوان مراۃ الغیب ہے - اس میں قصیدے غزلیں - رباعیاں - قطعے - تاریخیں سب کچھ ہیں +

دوسرا دیوان "صنم خانہ عشق" ہے - یہ پہلے دیوان سے زبان کی صفائی اور کلام کی پختگی میں بڑھا ہوا ہے +

تیسرا دیوان "محامد خاتم النبین" ہے - یہ نعت میں ہے اگرچہ اس میں بھی وہی خوبیاں پائی جاتی ہیں - جو اور دیوانوں میں ہیں - لیکن عام طور پر تاثیر اور سوز و گداز سے خالی ہے + ان تصنیفوں کے علاوہ "جوہر انتخاب" - "گوہر انتخاب" "مضامین دل آشوب" واسوختوں اور قصیدوں کا مجموعہ - مثنویوں میں "نور تجلی" - "ابر کرم" اور "شاہ انبیاء" ہیں +

ان کی سب سے بڑی اور مفید تصنیف امیر اللغات ہے - جو افسوس ہے کہ پوری نہ ہوسکی - صرف دو جلدیں

چھپی ہیں۔ جن میں صرف الف کی تختی ہے۔

کلام کا نمونہ:۔

غزلیں

مرے دل میں پاکے جگہ نئی ترے رخ کی جلوہ گری رہی
نہ کہیں چلی نہ کہیں پھری اسی شیشہ میں یہ پری رہی
یہ یہیں کے سارے کرشمے تھے جو یہاں سے آگے میں بڑھ گیا
نہ ثمر نہ بے ثمری رہی نہ اثر نہ بے اثری رہی
مری شاخ گلشن آرزو ہوئے کچھ نہ واقف رنگ بو
نہ پھل اس میں کوئی کبھی لگا نہ کلی کھلی نہ ہری رہی
نہ یہ کی کسی نے انہیں خبر کہ گیا جہاں سے کوئی گزر
اسی آرزو میں کٹی پہر مری لاش در پہ دھری رہی
جو بڑے بڑے تھے جہانکشا انہیں کیا فلک نے مٹا دیا
نہ عروج چتر شہی رہا نہ ضیائے تاج زری رہی
نہ سنا فسانۂ شور و شر ہوئی خواب ہی میں مری بسر
نہ ہوئی کسی کی کبھی خبر مجھے سب سے بیخبری رہی
عجب اشتیاق امیر تھا اسے دید طرز حرام کا

کہ زمین کوچۂ معشوقانہ پاٹے کبک دری رہی

عالم شگفتہ ہو جو میں آفت رسیدہ ہوں
صبح بہار ہوں جو گریباں دریدہ ہوں

راغب مری طرف ہے کوئی دل نہ کوئی گوش
بزم جہاں میں حرف مکرر شنیدہ ہوں

اے اہل بزم مجھ کو اٹھاؤ نہ بزم سے
شمع سحر ہوں عمر بیاباں رسیدہ ہوں

اب تک کسی پہ میری حقیقت نہیں کھلی
حرف نگفتہ ہوں سخن ناشنیدہ ہوں

پیدا کئے کی شرم الٰہی ضرور ہے
تو آفریدگار ہے میں آفریدہ ہوں

مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے
دونوں سے مثل سرو میں دامن کشیدہ ہوں

دیکھوں کسی کے عیب تو کیا خاک کہہ سکوں
ہاں غم سے آئینہ کی طرح آبدیدہ ہوں

بلبل ہوں میں نہ گل ہوں گلستان دہر میں

ہاں اک پرِ شکستہ و رنگ پریدہ ہوں
شبنم کے اے امیرؔ ملے ہیں مجھے نصیب
گل ہنس پڑیں چمن میں جو میں آبدیدہ ہوں

میری طرح نہ اک دن ابر بہار رویا
وہ ایک بار رویا میں لاکھ بار رویا
مجنوں سے میں نے پوچھا کل حال بیخودی کا
کچھ کہہ سکا نہ منہ سے پر زار زار رویا
کیا بیکسی کا عالم میرے مزار پر ہے
جو آگیا وہ بن کر شمع مزار رویا
آواز دے رہے ہیں مقتل میں زخم بسمل
خنداں ہوا جو پہلے انجام کار رویا
پوچھی امیرؔ سے کل میں نے جو دل کی حالت
سینے پہ ہاتھ رکھ کر بے اختیار رویا

ذوق مے نوشی بڑھاتی ہے گھٹا برسات کی
اور لے اڑتی ہے مستوں کو ہوا برسات کی

ابر۔ دریا۔ سبزہ۔ ساقی۔ یار مطرب دخت رز
ہوں یہ سب ساماں تو پھر دیکھیں فضا برسات کی
رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نوعروسان چمن
پتی پتی سے برستی ہے ادا برسات کی
مور ناچیں کوئلیں کوکیں پپیہے بول اٹھے
وصل کے دن آگئے فصل آئی کیا برسات کی
ساقیا بام و سبو سے ایسی آرائش بڑھے
آکے بیخانہ پہ صدقے ہو گھٹا برسات کی

پیکاں ہی تیرے تیر کا پہلو میں در آئے
ٹھنڈا ہو کلیجہ بھی اور امید بر آئے
کوٹھے سے نزاکت تو اترنے نہیں دیتی
تم آنکھوں سے دل میں مرے کیونکر اتر آئے
حوروں سے ملا لوں میں کسی شوخ کی صورت
دم بھر کو اگر چرخ سے جنت اتر آئے
رہ رہ کے وہ پچھتاتے ہیں کہ کیوں اس کو ستایا
تنعم کے مری آہ میں یارب اثر آئے

دیکھی جو مری یاس ترس کھا کے یہ بولے
اللہ کرے اب تری امید بر آئے

متفرق اشعار

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا
مجھی سے پھر گلہ الٹا مرے چاک گریباں کا

مرغان باغ تم کو مبارک ہو سیر گل
کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

دیر کی تحقیر اتنی کرتے اے شیخ حرم
آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بتخانہ تھا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا

آنے والا جانے والا بیکسی میں کون تھا
ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں

سچ سچ بتا یہ لفظ انہیں کی زباں کے ہیں
نہ کیا ے یاس یوں برباد میرے خانۂ دل کو
اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو سر میں جنبش
کہاں گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں مجھے پھنسا کر

حالی

ان کا نام خواجہ الطاف حسین تھا۔ اور حالی تخلص کرتے تھے۔ خواجہ ایزو بخش کے بیٹے تھے۔ ولادت پانی پت میں ۱۸۳۷ء مطابق ۱۲۵۳ھ کو ہوئی۔ ان کا ددھیال انصاری اور ننھیال سادات کے ایک عزت دار گھرانے میں تھا۔

ان کے پیدا ہونے کے بعد ان کے باپ کا دماغ خراب ہوگیا۔ اور جب یہ نو برس کے ہوئے تو ان کے باپ انتقال کر گئے۔

ان کی تعلیم و تربیت قاعدہ سے نہیں ہوئی۔ اول انہوں نے قرآن شریف زبانی یاد کیا۔ پھر اپنے شوق سے

سید جعفر علی سے کچھ فارسی پڑھی + مولوی ابراہیم حسین انصاری
سے عربی پڑھ رہے تھے کہ ان کے عزیزوں نے ان کی
شادی کردی۔ اس وقت ان کا سن سترہ سال کا تھا۔
شادی کے بعد یہ چھپ کر دلی چلے گئے +

دلّی میں مولوی نوازش علی سے عربی زبان کی صرف
ونحو اور منطق پڑھی + ابھی پڑھ ہی رہے تھے کہ پھر ان کے
عزیزوں نے ان کو پانی پت بلا لیا + گھر آکر انہوں نے دو
ڈیڑھ برس خود کتابیں دیکھیں۔ پھر ۵۷ء کا غدر شروع
ہوگیا اور چھ سات برس تک ان کو نکلنے کا موقع نہ ملا۔
پھر بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے + اس زمانہ میں مولوی
محب اللہ۔ مولوی قلندر علی اور مولوی عبد الرحمٰن محدث
سے کبھی منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں اور کبھی حدیث و
تفسیر کا مطالعہ کیا + جب یہ لوگ باہر چلے جاتے تھے تو شروح
اور حاشیوں سے ادب کی کتابیں خود مطالعہ کیا کرتے تھے +

جس زمانہ میں دلّی میں یہ طالب علمی کی زندگی بسر کر
رہے تھے۔ تو اکثر مرزا غالب کے پاس آیا جایا کرتے تھے +
غالب کے دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے۔ یہ ان

کے معنی ان سے پوچھا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں مرزا نے اپنے
کئی قصیدے بھی انہیں پڑھا دئے تھے۔

غدر کے بعد جب کئی سال انہیں پانی پت میں بیکار
رہتے گزر گئے۔ تو یہ روزی کی فکر میں وطن سے نکلے۔
اتفاق سے نواب مصطفی خاں شیفتہ سے جان پہچان ہو گئی
اور یہ ان کی مصاحبت میں رہنے لگے۔ نواب صاحب مرزا
غالب کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ انہیں کے ساتھ مولانا
بھی اپنا کلام مرزا کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ نواب صاحب
کی طبیعت نے مولانا کی طبیعت پر زیادہ اثر کیا۔ اور اسی
صحبت نے ان کو جدید رنگ کی شاعری کی طرف توجہ دلائی۔
پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت کے زمانہ میں
ان کو انگریزی طرز ادا سے زیادہ مناسبت ہو گئی۔ اور
ایشیائی انشا کے فضول حصوں کی وقعت ان کے دل سے
دور ہو گئی۔

۱۸۷۴ء میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر صیغہ تعلیمات نے
پنجاب میں ایک نئی قسم کی شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اس میں
مولانا نے بھی پروفیسر آزاد کے ساتھ چار مثنویاں لکھیں۔

جن کے نام یہ ہیں (۱) برکھا رت (۲) نشاط امید۔ (۳) مناظرہ رحم و انصاف (۴) حب وطن + یہ مثنویاں لوگوں نے بہت پسند کیں + اینگلو عربک اسکول کی مدرسی کے زمانہ میں بھی اسی قسم کی کئی نظمیں مولانا نے لکھیں + اس زمانہ میں سرسید نے ان سے کہا کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کی حالت کو نظم میں لکھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک لمبی نظم "مدوجزر اسلام" لکھی۔ جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے +

۱۸۹۳ء میں انہوں نے اپنا اردو دیوان چھپوا کر شائع کیا + جس میں ان کی نئی پرانی اردو نظمیں شامل ہیں + دیوان چھپ جانے کے بعد انہوں نے کئی اور بھی نظمیں لکھیں۔ جن میں سب سے آخری وہ نظم ہے۔ جو انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کے مرنے پر لکھی تھی +

۱۹۰۴ء میں انہیں شمس العلما کا خطاب ملا +

ان کی نثر کی کتابوں اور ان کی نثر کی طرز پر میں نثر نگاروں کے تذکرہ میں لکھ چکا ہوں۔ نظم کے متعلق یہ لکھنا کافی ہے۔ کہ ان کی طرز کا اب تک کوئی شاعر نہ پیدا ہو سکا +

۱۳ ‌صفر ۱۳۳۳ھ کو مولانا کا انتقال ہوا +

مسدس حالی کا نمونہ:۔

راہ ترقی

مشقت کی ذلت جنہوں نے اٹھائی جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی فضیلت نہ عزت نہ فرمانروائی
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں

نہ بونصر تھا نوع میں ہم سے بالا نہ تھا بوعلی کچھ جہاں سے نرالا
طبیعت کو بچپن سے محنت میں ڈالا ہوئے اس لئے صاحب قدر والا
اگر فکر کسب ہنر تم کو بھی ہو
تمہیں پھر ابونصر اور بوعلی ہو

بہت ہم میں اور تم میں جوہر ہیں مخفی خبر کچھ نہ ہمکو نہ تم کو ہے جن کی
اگر جیتے جی کچھ نہ اُن کی خبر لی تو ہو جائیں گے ملکے مٹی میں مٹی
یہ جوہر ہیں ہم میں امانت خدا کی
مبادا تلف ہو ودیعت خدا کی

یہی جو کہ پھرتے ہیں بے علم و جاہل بہت انمیں ہیں جنکے جوہر ہیں قابل
رذائل میں پنہاں ہیں اُنکے فضائل انہیں ناقصوں میں ہیں پوشیدہ کامل

نہ ہوتے اگر مائل لہو بازی
ہزاروں انہیں میں تھے طوسی و رازی

شرافت محنت

نہ راحت طلب ہیں نہ دولت طلب وہ | لگے رہتے ہیں کام میں روز و شب وہ
نہیں لیتے دم ایکدم بے سبب وہ | بہت جاگ لیتے ہیں سوتے ہیں تب وہ

وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا
کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا

جنہیں گر نہ وہ ہوں کھنڈر کاخ والوں | بنیں گر نہ وہ شاہ کشور ہو عریاں
جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاندار بیجاں | جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں خیگل گلستاں

یہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بیکل ہو سارے

کھپاتے ہیں کوشش میں تاب و تواں کو | گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو
سمجھتے نہیں اسمیں جاں اپنی جاں کو | وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو

بس اس طرح جینا عبادت ہے ان کو
اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے انکو

مشقت میں عمر انکی کٹتی ہے ساری | نہیں آتی آرام کی انکے باری

سدا باگ ڈور انکی رہتی ہے جاری نہ آندھی میں عاجز نہ مینہ میں ہیں عاری
نہ لُو جیٹھ کی دم تڑاتی ہے ان کا
نہ ٹھِر ماگھ کی جی چھڑاتی ہے ان کا
نہ احباب کی تیغ احساں سے گھائل نہ بیٹے سے طالب نہ بھائی سے سائل
نہ دکھ درد میں سوئے آرام مائل نہ دریا وکوہ انکے رستے میں حائل
سنے ہوں گے کبھی رستم و سام جیسے
غیور اب بھی لاکھوں ہیں گمنام ویسے
کسی کو یہ دھن ہے کہ جو کچھ کمائیں کھلائیں کچھ اوروں کو کچھ آپ کھائیں
کسی کو یہ کد ہے کہ جھیلیں بلائیں یہ احساں کسی کا نہ ہرگز اٹھائیں
کوئی محو ہے فکر فرزند و زن میں
کوئی چور ہے حُب اہل وطن میں
جو مصروف ہے کشتکاری میں کوئی تو مشغول دوکانداری میں کوئی
عزیزوں کی ہے غمگساری میں کوئی ضعیفوں کی خدمتگزاری میں کوئی
یہ ہے اپنی راحت کے سامان کرتا
وہ کنبہ پہ ہے جان قربان کرتا
کوئی اس تگ و دو میں رہتا ہے ہر دم کہ دولت جہاں تک ہو کیجے فراہم
رہیں جیتے جی تا کہ خود شاد و خرم مریں جب تو دل پر نہ لیجائیں یہ غم

کہ بعد اپنے کھائیں گے فرزند و زن کیا
سوا اس ان کا اور اپنا ہوگا کفن کیا

بہت دل میں اپنے یہ رکھتے ہیں ارماں
کہ کر جائیں یاں کوئی کار نمایاں

وہ ہوں تا کہ جب چشم عالم سے پنہاں
تو ذکر جمیل انکا باقی رہے یاں

یہی طالب شہرت و نام لاکھوں
بناتے ہیں جمہور کے کام لاکھوں

تضیع اوقات

وہ بے مول پونجی کہ ہے اصل دولت
وہ شائستہ ملکوں کا گنج سعادت

وہ آسودہ قوموں کا راس البضاعت
وہ دولت کہ ہے وقت جس سے عبارت

نہیں اس کی وقعت نظر میں ہماری
یونہی مفت جاتی ہے برباد ساری

اگر ہم سے مانگے کوئی ایک پیسا
تو ہوگا کم و بیش یاراس کا دینا

مگر ہاں وہ سرمایۂ دین و دنیا
کہ ایک ایک لمحہ ہے انمول جس کا

نہیں کرتے خست اڑانے میں اس کے
بہت ہم سخی ہیں لٹانے میں اُس کے

اگر سانس دن رات کی سب گنیں ہم
تو نکلیں گے انفاس ایسے بہت کم

کہ ہو جن میں کل کے لئے کچھ فراہم　　یونہی گزرے جاتے ہیں دن رات پیہم

نہیں کوئی گویا خبردار ہم میں

کہ یہ سانس آخر ہے اب کوئی دم میں

گڈریے کا وہ حکم بردار کتا　　کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوالی کرتا

جو ریوڑ میں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا　　تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے بپھرا

گر انصاف کیجے تو ہے ہم سے بہتر

کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

وہ قومیں جو سب راہیں طے کر چکی ہیں　　ذخیرے ہر اک جنس کے بھر چکی ہیں

ہر اک بوجھ بار اپنے سر دھر چکی ہیں　　ہوئی تب ہیں زندہ کہ جب مر چکی ہیں

اسی طرح راہ طلب میں ہیں پویا

بہت دور ابھی ان کو جانا ہے گویا

کسی وقت جی بھر کے سوتے نہیں وہ　　کبھی سیر محنت سے ہوتے نہیں وہ

بضاعت کو اپنی ڈبوتے نہیں وہ　　کوئی لمحہ بیکار کھوتے نہیں وہ

نہ چلنے سے تھکتے نہ اکتاتے ہیں وہ

بہت بڑھ گئے اور بڑھے جاتے ہیں وہ

مگر ہم کہ اب تک جہاں تھے وہیں ہیں　　جمادات کی طرح بار زمیں ہیں

ہیں دنیا میں ایسے کہ گویا نہیں ہیں　　زمانہ سے کچھ ایسے فارغ نشیں ہیں

کہ گویا ضروری تھا جو کام کرنا
وہ سب کر چکے ایک باقی ہے مرنا

ہندوستان کی معزز قومیں

یہاں اور ہیں جتنی قومیں گرامی — خود اقبال ہے آج ان کا سلامی
تجارت میں ممتاز دولت میں نامی — زمانہ کے ساتھی ترقی کے حامی

نہ فارغ ہیں اولاد کی تربیت سے
نہ بے فکر ہیں قوم کی تقویت سے

دُکان انکی ہے اور بازار ان کا — بنج ان کا ہے اور بیوپار ان کا
زمانہ میں پھیلا ہے بیوپار ان کا — ہے پیر و جواں برسرکار ان کا

مدار اہلکاری کا ہے اب انہیں پر
انہیں کے ہیں آفس انہیں کے ہیں دفتر

معزز ہیں ہر ایک دربار میں وہ — گرامی ہیں ہر ایک سرکار میں وہ
نہ رسوا ہیں عادات و اطوار میں وہ — نہ بدنام گفتار و کردار میں وہ

نہ پیشہ سے حرفہ سے انکار ان کو
نہ محنت مشقت سے کچھ عار ان کو

طبیعت میں اک اک کے ہے خاکساری — بڑا سن کے کرتے ہیں وہ بردباری

تواضع ہے سب کی رگ و پے میں ساری دماغ ان کے ہیں کبر و نخوت سے عاری
نہ باتوں میں ان کی حقارت کسی کو
نہ جلسوں میں ان کے مذمت کسی کو

جو گرتے ہیں گر کر سنبھل جاتے ہیں وہ پڑے زد تو بچ کر نکل جاتے ہیں وہ
ہر اک سانچہ میں جا کے ڈھل جاتے ہیں وہ جہاں رنگ بدلا بدل جاتے ہیں وہ
ہر اک وقت کا مقتضی جانتے ہیں
زمانے کے تیور کو پہچانتے ہیں

مگر ہے ہماری نظر اتنی اونچی کہ یکساں ہے واں سب بلندی و پستی
نہیں اب تک اصلا خبر ہم کو اتنی کہ ہے کون مردار کتنا ترقی
جدھر کھول کر آنکھ ہم دیکھتے ہیں
زمانے کو اپنے سے کم دیکھتے ہیں

زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا کہ ہے آشتی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

غمخواری بنی نوع انسان

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے ۔ نشاں جن سے قائم ہیں صدق و صفا کے
نہ شہرت کے خواہاں نہ طالب ثنا کے ۔ نمائش سے بیزار دشمن ریا کے

ریاضت سب انکی خدا کے لئے ہے
مشقت سب انکی قضا کے لئے ہے

کوئی ان میں ہے حق کی طاعت پہ مفتوں ۔ کوئی ہیگا حق کی اشاعت پہ مفتوں
کوئی زہد و صبر و قناعت پہ مفتوں ۔ کوئی پند و وعظ جماعت پہ مفتوں

کوئی موج سے آپ کو ہے بچاتا
کوئی ناؤ ہے ڈوبتوں کی تراتا

بہت نوع انساں کے غمخوار و یاور ۔ ہوا خواہ ملت بد اندیش کشور
شدائد کے دریا لیے خون میں شناور ۔ جہاں کی پر آشوب کشتی کے لنگر

ہر اک قوم کی ہست و بود ان سے ہے یاں
کہ اس انجمن کی نمود ان سے ہے یاں

کسی پر ہو سختی صعوبت ہے ان پر ۔ کسی پر ہو غم رنج و کلفت ہے انپر
کہیں ہو فلاکت مصیبت ہے انپر ۔ کہیں آئے آفت قیامت ہے انپر

کسی پر چلے نیر امارج یہ ہیں

لئے کوئی رہگیر تاراج یہ ہیں

یہ ہیں حشر تک بات پر اڑنے والے　　یہ پیچاں کو میخوں سے ہیں جڑنیوالے
یہ فوجِ حوادث سے ہیں لڑنے والے　　یہ عیر وتکی ہیں آگ میں پڑنیوالے

امنڈتا ہے رُکنے سے اوران کا دریا
جنہوں سے زیادہ ہے کچھ ان کا سودا

جماتے ہیں جب پاؤں ہٹتے نہیں یہ　　بڑھا کر قدم پھر پلٹتے نہیں یہ
گئے پھیل جب پھر سمٹتے نہیں یہ　　جہاں بڑھ گئے بڑھ کے گھٹتے نہیں یہ

مہم بن گئے سر نہیں بیٹھتے یہ
جب اٹھتے ہیں اٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ

خدا نے عطا کی ہے جو انکو قوت　　سمائی ہے دل میں بہت انکی عظمت
نہیں پھیرتی انکا منہ کوئی زحمت　　نہیں کرتی زیر انکو کوئی بھی صورت

بھروسہ پہ اپنے دل ودست وپا کے
سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے

نہیں مرحلہ کوئی دشوار ان کو　　ہر اک راہ ملتی ہے ہموار ان کو
گلستاں ہے صحرائے پُرخار ان کو　　برابر ہے میدان وکہسار ان کو

نہیں حائل انکے کوئی رہگذر میں
سمندر ہے پایاب اُن کی نظر میں

اسی طرح یاں اہل ہمت ہیں جتنے — کمر بستہ ہیں کام پر اپنے اپنے
جہاں کی ہے سب دھوم دھام انکے دم سے — فقیر اور غنی سب طفیلی ہیں انکے

بغیر ان کے بے ساز و سامان تھی مجلس
نہ ہوتے اگر یہ تو ویران تھی مجلس

زمیں سب خدا کی ہے گلزار انہیں سے — زمانہ کا ہے گرم بازار انہیں سے
ملے ہیں سعادت کے آثار انہیں سے — کھلے ہیں خدائی کے اسرار انہیں سے

انہیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو
انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو

انہیں سے ہے آباد ہر ملک و دولت — انہیں سے ہے سرسبز ہر قوم و ملت
انہیں پر ہے موقوف قوموں کی عزت — انہیں کی ہے سب ربع مسکوں میں برکت

دم انکا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

انہیں کا اجالا ہے ہر رہگزر میں — انہیں کی ہے یہ روشنی دشت و در میں
انہیں کا ظہورا ہے جب خشک وتر میں — انہیں کے کرشمے ہیں سب بحر و بر میں

انہیں سے ہے رتبہ یہ آدم نے پایا
کہ سر اس سے روحانیوں نے جھکایا

ہر اک ملک میں خیر و برکت ہے ان سے — ہر اک قوم کی شان و شوکت ہے ان سے

نجابت ہے ان سے شرافت ہے ان سے　　شرف ان سے فخر ان سے عزت ہے ان سے

جفاکش بنو گر ہو عزت کے خواہاں
کہ عزت کا ہے بھید ذلت میں پنہاں

غزلیں

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی ہے جو ابد تک وہ ہے جلال تیرا

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعب جمال تیرا

چھوٹے ہوئے ہیں گو جی پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چھٹنا محال تیرا

گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا

اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کے جلال تیرا

دل ہو کہ جان تجھ سے کیونکر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری جاں ہے سو مال تیرا

بیگانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہل حال تیرا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسہ نہ کیجئے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجئے گا
ہو لاکھ غیروں کا غیر کوئی نہ جاننا اس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اس کو تصور اپنا نہ کیجئے گا
اسی میں ہے خیر حضرت دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد۔ اس کی بھول کر بھی کبھی تمنا نہ کیجئے گا
تمہارا تھا دوستدار حالی اور اپنے بیگانہ کا رضا جو
سلوک اس سے کئے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجئے گا

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں
یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے رابطہ مگر اس قدر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں   مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح   لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
دل پُر درد سے کچھ کام لوں گا   اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

رباعیاں

کانٹا ہر اک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہر اک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں ہے کھٹکا تیرا

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے
دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سکھ میں بھول جائیں اطفال

لیکن انہیں دکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا
اور امّتوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار
بچھڑے ہوئے گلہ کو بہم تو نے کیا

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

متفرق اشعار

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کوئی آسماں نہ تھا

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی ہیں
مرے گناہ میں ہیں رند و پارسا اک ایک

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

سخت مشکل ہے شیوہ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

ترک دنیا کے علائق تو کئے سب زاہد
گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی

پروفیسر آزاد

مولوی محمد حسین نام - آزاد تخلص - باپ کا نام باقر علی تھا- دلی کے رہنے والے اور قوم کے مغل تھے + آزاد کے والد شیخ ابراہیم ذوق کے بڑے دوست تھے - آزاد ان کو چچا کہا کرتے تھے - انہیں کے زیر سایہ انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی + عروض اور شاعری کا سارا فن انہوں نے ذوق ہی سے سیکھا + جب ذوق کا انتقال ہوگیا - تو حکیم آغا جان عیش کی صحبت سے فائدہ اٹھایا + آزاد نے پرانے دہلی کالج میں بھی تعلیم پائی تھی +

غدر کے ہنگامے میں آزاد کا گھر بار لٹ گیا - باپ مار

ڈالے گئے۔ اسی میں ان کے استاد کی عمر بھر کی کمائی یعنی ان کا کلام بھی برباد ہوگیا + کچھ دنوں پریشان ادھر اُدھر مارے پھرتے رہے۔ آخرکار لاہور پہنچے اور سر رشتہ تعلیم میں پندرہ روپلے ماہوار کے ملازم ہوگئے۔ اور اس پر مدتوں پڑے رہے۔ ہوتے ہوتے پچھتر روپلے تک ترقی ہوئی +

اس وقت سرکار چاہتی تھی کہ اردو زبان کو ترقی ہو۔ اس لئے سرکار ہی کی طرف سے انجمن پنجاب میں مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی + یہاں غزلیں نہیں بلکہ نظمیں پڑھی جاتی تھیں + انہوں نے نمونہ کے طور پر کئی نظمیں لکھیں اور ان کو لوگوں نے بہت پسند کیا +

اسی زمانہ یعنی ۱۸۶۵ء میں سرکاری کام سے یہ کلکتہ بھیجے گئے۔ اور کچھ دنوں بعد میر منشی پنجاب کے ہمراہ کابل اور بخارا کا سفر کیا + ۱۸۸۳ء میں ایران گئے +

ان کی نثر کتابوں کی نسبت ہم اپنے نثر نگاروں کے تذکرہ میں لکھ چکے ہیں۔ نظم میں انہوں نے ایک نئی طرز نکالی یعنی پرانی شاعری کو ہٹا کر نئی قسم کی شاعری کو رواج دیا۔ اور عاشقانہ خیالات کی جگہ قدرتی مضامین بیان کئے +

نمونہ کے طور پر ان کی دو نظمیں ہم یہاں لکھتے ہیں:-

شام کی آمد اور رات کی کیفیت

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانہ کے پیہم قدم ترے
پیمانے محنتوں کے ہیں یہ بیش و کم ترے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے
اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
ہوتا زمانہ بس کہ ہے وابستہ شام سے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے
دامان کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو
آ۔ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادی مشکیں نسب ہے تو
ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں تیرا
اڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں تیرا

تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں
لہراتا پرنیاں و حریر سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر
فرماں نشاں ہیں یہ اڑے گا جہان پر
تا صبح ہووے کارگہ روزگار بند
آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند
عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسنے کو رخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے
سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر
چھائی غرض خدائی میں رات ہے

اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی
اور رات سائیں سائیں ہے کرتی گھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پر اور شاہ تخت پر
ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے
داماں دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی
چوکا ہے بلکہ راہ زن نابکار بھی
القصہ سب ہے امیر کوئی یا فقیر ہے
عورت ہے یا کہ مرد جوان ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے یا کہ پیٹ میں
سب آ گئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں
جس کو پکارو وہ سوئے خواب عدم گیا
دریا بھی اپنے چلنے سے تھا ہارا ہے تھم گیا
وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر
بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر

کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے
رکھ کر کرن کا تاج نکلتا ہے شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے
سکہ ہے اب ستارے دن کا اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اس کا راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا
مزدور جا بجا تھے جو دکھ درد و پار ہے
اور پاؤں تک سروں سے پسینے بہار ہے
بار گراں غریبوں نے سر پر اٹھائے ہیں
جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں
اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے
اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں
پر دل کو ان کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں
سامان عیش سب ہیں مہیّا کئے ہوئے
جو مانگئے زمانہ ہے حاضر کئے ہوئے
مخمل کا فرش ہے مگر آرام ہی نہیں

جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں
اور ان کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے
دن بھر اٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے
تھا صبح دم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو
وہ حق حلال کر کے گھر آیا ہے شام کو
اب اپنی نان خشک کو پانی میں چور کر
کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر
سر پر قیامت آئے تو اسکی خبر نہیں
سوتا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں
یہ بھی نہ کہنا تم کہ جو آرام عام ہے
وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے
بندے خدا کے ایسے یہاں ئلے شمار ہیں
دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں
کیجے ذرا خیال کہ ملّا ئے نکتہ داں
بیٹھا ہے سر جھکائے بپا ئے چرا غداں
کرتا نظر ہے متن پہ بھی حاشیہ پہ بھی
مضمون جو ہمدگر ہیں الجھتے کبھی کبھی

بیٹھا حرام کرکے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں
کل صبح امتحاں ہے سو اس کے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے
پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ غور و فکر سے
کر لیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیاں ہے
کل صبح اپنی جاں ہے اور امتحاں ہے
جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پہ محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کے ہے دم دلے ہوئے
بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتا لیئے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھدام کی
اور دیکھنا نجومی دانا کی شان کو

ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسماں کو
اک آنکھ دوربین پہ ہے اک کتاب پر
ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر
گنتی ہے اس کی تارے ہی گن کر تمام رات
پڑا ہُنو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات
اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چھاپے جو اس میں اپنا ستارا تو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
وزد سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکان میں ہے
اور ہاتھ ڈال اس کی ہر اک این و آن میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائیگا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اڑائیگا

اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے
پھرنا ٹٹولنا ہوا مانند کور ہے

مطلب اڑاتا شعر سے مضمون غزل سے ہے
لاتا پرایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے
تعریفیں اسکی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضمون گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں
عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورت امید وار ہے
اور کرتا صدق دل سے دعا بار بار ہے
مجھ کو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانہ کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے
اے رات یہ جو تو نے سر شام آن کر
سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
اور اس پہ حق پرست کہ یاد خدا میں ہے
بیٹھا رہ فنا پہ ہوائے بقا میں ہے
اس کو اسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی

اور دل میں دمبدم ہے تگ و دو لگی ہوئی
کب تک رہے حباب گلا گھونٹ گھونٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر لوٹ پھوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے
اہل جہاز جن کا خدا کارساز ہے
بیٹھے اسی کی آس پہ ہیں دل دئے ہوئے
کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لئے ہوئے
باد مراد دیتی ہوا کے مراد ہے
پر دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پر
اور جاتی ہے دعا کی صدا آسمان پر
یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی امید پر
اے ناخدا تو رہیو خدا کی امید پر

دل دے رہا جو شیر محبت کے جام ہے
ہاں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے دن کے تھک رہی
بچے کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی

اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے بانہ کل پڑے
ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا دھیان ہے
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے
پر جائے حیف حال اسی جاں بلب کا ہے
سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے
لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی
اور بیکسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہے
اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے
کوئی اس کا ساتھ دیویگا ہو صبح جب تلک
روئے گا کوئی شام کے مردے کو کب تلک
آرزو آفریں ترے لطف زبان کو
پہ کروٹ اب ہے رات نے دی آسمان کو
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دئے ہوئے

تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پیے ہوئے
کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

ابر کرم

چلنا وہ بادلوں کا زمین چوم چوم کر
اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آتی ادھر صبا ہے ادھر سے نسیم بھی
اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
مستی میں جھومنا وہ جوانان باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا
سبزہ کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز
ان سبز سبز کاریوں پہ دل ہیں لوٹتے
طوطے برنگ طائر بسمل ہیں لوٹتے

شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی
موتی بکھیرتی ہے جواہر لٹا رہی
پتوں پہ آب و رنگ سے مینا نگار ہیں
ٹپکیں اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں
لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آ گئے
اور شامیانے شرق سے تا غرب چھا گئے
کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے
برسے گا آج خوب دھواں دھار ابر ہے
لیکن یہ باجا سا برسنا بھوار کا
ہے گا پیام ابر بہاری کے تار کا
بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں پھولوں کی لالیاں
وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کھاڑیاں بھری ہوئی تھالے چھلک رہے
آب رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھوکر سنوارنا
گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے

اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے زور سے
جل تھل ہیں کوہ و دشت ہیں تالاب آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے
ہر جا پہ طائران چمن غول غول ہیں
آپس میں بولی بول کے کرتے کلول ہیں
کوئل کا دُور دُور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہل درد کے نشتر گھنگھولنا
طاؤس کا وہ دُم کو چنور کر کے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا
لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو مور ہے
اک قہقہہ بہ طنز لگاتا چکور ہے
املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہُوا
اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہُوا
جھولوں میں نوجواں ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور نیچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا رہے طوفان لوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں

پھر مجھ کو رشک ہے اسی مست مدام پر
جس کی کہ میکشی نہیں موقوف جام پر
مستانہ پن میں رکھتا ہے دیوانہ طور بھی
مستانے ساتھ رکھتا ہے دو چار اور بھی
سبزہ پہ لوٹتا ہے دماغ آسماں پہ ہے
اور دمبدم یہ مطلع موزوں زباں پہ ہے
یوں پھوٹ کر جو ہیں گل و ریحاں نکل پڑے
کیا جانوں کن دنوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

داغ

نواب مرزا خاں نام - داغ تخلص - نواب شمس الدین خاں کے بیٹے تھے - ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ ہجری مطابق ۱۸۳۱ عیسوی روز چہار شنبہ کو دہلی کے محلہ بلیماراں میں پیدا ہوئے - چھ سات سال کا سن تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا - ان کی ماں شاہ ابوظفر کے بیٹے شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو کے گھر بیٹھ گئیں اور شوکت محل کا خطاب پایا + یہ بھی باپ کے ساتھ قلعہ میں پہنچے ؛

داغ کی قلعہ ہی میں تعلیم و تربیت ہوئی - انھوں نے خوشنویسی - فن سپہ گری اور شہ سواری - بانک - پھکیتی

نشانہ اندازی وغیرہ سب قلعہ ہی میں سیکھیں + اس سے پہلے غیاث اللغات کے مؤلف غیاث الدین سے فارسی کی درسی کتابیں پڑھ چکے تھے۔ پھر قلعہ میں احمد حسین ولد میر غلام حسین ان کے معلم مقرر ہوئے۔ میر صاحب میر تقی میر کے شاگرد تھے ❊

قلعہ میں شاعری کا بھی بازار گرم تھا۔ ان کی طبیعت بھی اس طرف متوجہ ہوئی۔ تو ولی عہد بہادر نے ان کو ذوق کا شاگرد کرا دیا + اس وقت ان کا سن گیارہ بارہ سال کا تھا ❊

غدر سے دس ماہ پہلے ۱۲۷۲ھ میں شہزادہ ولی عہد بہادر نے ہیضہ سے انتقال کیا۔ غدر نے اور بھی اوسان کھو دئے۔ اس طرح ان کی عیش و عشرت کا خاتمہ ہو گیا ❊

غدر دور ہونے کے بعد یہ رام پور چلے آئے اور نواب یوسف علی خاں کے یہاں دم لیا۔ اور نواب یوسف علی خاں کے بعد ان کے بیٹے نواب کلب علی خاں نے ان کی سرپرستی کی + نواب کلب علی خاں کے مرنے کے بعد یہ حیدر آباد دکن گئے۔ وہاں ساڑھے چار سو روپے ان کی

تنخواہ مقرر ہو گئی۔ اور حضور نظام میر محبوب علی خاں کے استاد ہو گئے + میر محبوب علی خاں نے ان کو یار وفادار۔ مقرب السلطان۔ بلبل ہندوستان جہاں استاد۔ ناظم یار جنگ۔ دبیر الدولہ۔ فصیح الملک کے خطابات عطا فرمائے +

دکن میں مرزا داغ نے میر محبوب علی خاں کی فیاضی و دریا دلی کی وجہ سے بہت عزت کی زندگی بسر کی۔ ملک بھر میں داغ کا نام گونجنے لگا۔ ہر محفل میں آپ کی غزلیں گائی جانے لگیں۔ ملک بھر میں کوئی دو ہزار شاگرد داغ سے اصلاح لینے لگے۔ غرض ہر طرف داغ کی دھوم مچ گئی آخر کار ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ کو انتقال ہو گیا۔ یہیں حیدر آباد میں دفن ہوئے +

ان کے تین دیوان ہیں۔ گلزار داغ۔ آفتاب داغ اور مہتاب داغ + ایک مثنوی بھی ہے۔ جس کا نام فریاد داغ ہے +

داغ کی زبان میں فصاحت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ بیان میں شوخی۔ تیکھا پن اور بانکپن غضب کا تھا۔ کلام کو دیکھو محاوروں اور روزمرہ کا دریا بہہ رہا ہے۔ عشق

و محبت کے معاملات ایسے مزے ہیں ادا کرتے تھے کہ سن کر
اب تک لوگ سر دھنتے ہیں۔

داغ کے کلام میں معانی کی بلندی اور الفاظ کی شوکت
نہ ہو لیکن محاورے کی صفائی اور زبان کی درستی میں کوئی
نیا پرانا شاعر ان سے لگا نہیں کھا سکتا۔ سلاست روانی
برجستگی اور بے ساختگی آپ کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔
نمونہ کلام :۔

غزلیں

جانچ لو ہاتھ میں پہلے دل شیدا لے کر
نہیں پھرنے کا مری جان یہ سودا لے کر

ناز ہوتا ہے انہیں مال پرایا لے کر
دُون کی لیتے ہیں میرا دل شیدا لے کر

دل کا سودا جو کرے تم سے وہ سودائی ہے
دام دیتے ہی نہیں مال پرایا لے کر

رکھ دیا ہاتھ مرے منہ پہ تب کافر نے
صبح اٹھنے نہ دیا نام خدا کا لے کر

اپنی آنکھوں سے تو دیکھی نہیں دل کی چوری
کیوں گنہگار رہوں میں نام کسی کا لے کر

یہ بات بات میں کیا نازکی نکلتی ہے
دبی دبی ترے لب سے ہنسی نکلتی ہے

ٹھہر ٹھہر کے جلا دل کو ایک بار نہ پھونک
کہ اس میں بوئے محبت ابھی نکلتی ہے

بجائے شکوہ بھی دیتا ہوں میں دعا اس کو
مری زباں سے کروں کیا وہی نکلتی ہے

ہزار بار جو مانگا کرو تو کیا حاصل
دعا وہی ہے جو دل سے کبھی نکلتی ہے

ادا ادا سے تری کھنچ رہی ہیں تلواریں
نگہ نگہ سے چھری پر چھری نکلتی ہے

سمجھ تو لیجئے کہنے تو دیجئے مطلب
بیاں سے پہلے ہی مجھ پر چھری نکلتی ہے

یہ دل کی آگ ہے یا دل کے نور کا ہے ظہور
نفس نفس میں مرے روشنی نکلتی ہے

صنم کدہ میں بھی ہے حسن اک فدائی کا
کہ جو نکلتی ہے صورت پری نکلتی ہے

غم فراق میں ہو داغ اس قدر بیتاب
ذرا سے رنج میں جان آپ کی نکلتی ہے

ہمت کا ہارنا نہ مصیبت میں چاہیئے
تھوڑا سا حوصلہ بھی طبیعت میں چاہیئے

دل دو طرح کا تیری محبت میں چاہیئے
راحت میں ایک ایک مصیبت میں چاہیئے

آجائے راہ راست پہ کافر ترا مزاج
اک بندۂ خدا تری خدمت میں چاہیئے

اپنا بھی کام نکلے وہ ناراض بھی نہ ہوں
ایسے مزے کی بات شکایت میں چاہیئے

حاتم کا دل ہو دولت قاروں ہو عمر خضر
اے داغ یہ کسی کی محبت میں چاہیئے

متفرق اشعار

خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں اس میں
پھپھولوں سے مرے سینہ پہ عالم ہے مزارِ دل کا

ہو کے ظاہر تو کیا عشق نے اک حشر بپا
حسرت اس دل پہ کہ جس دل میں یہ پنہاں ہوگا

وعدہ پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار
اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ
گری ہی پڑتی ہے بیمار ناتواں کی طرح

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر
دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

دل میں سما رہی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کر دوں تو داغ نام نہیں

رہروِ راہ محبت کا خدا حافظ ہے

اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں
رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں

اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے
وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی رونا ہے الفت کا

تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے
یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم

بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری
دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے

جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے
دنیا میں جانتا ہوں کہ جنّت ملی مجھے

راحت اگر ذرا سی مصیبت میں مل گئی
تیرے جلوہ کا تو کیا کہنا مگر

دیکھنے والے کو دیکھا چاہیئے
پوچھ لیتے ہیں یہی رسم ہے جلا دوں میں

میرے قاتل نے نہ پوچھا تری حسرت کیا ہے
جلوہ دیکھا تیری رعنائی کا

کیا کلیجہ تھا تماشائی کا

اکبر الہ آبادی

سید اکبر حسین نام - اکبر تخلص - میر تفضل حسین کے بیٹے تھے + ۱۶ ر نومبر ۱۸۴۶ء مطابق ۱۲۶۲ھ کو بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے + الہ آباد میں رہتے تھے + آپ کا سلسلہ نسب امام رضا علیہ السلام سے ملتا ہے + دیسی مکتبوں اور سرکاری مدرسوں میں تعلیم پا کر ۱۸۶۷ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ میں نائب تحصیلدار ہو گئے پھر ترقی پا کر ۱۸۷۰ء میں ہائیکورٹ میں مسل خواں ہو گئے ۱۸۷۳ء میں ہائیکورٹ کی وکالت میں کامیابی حاصل کی اور کچھ برس بعد منصف ہو گئے + پھر ترقی کرتے کرتے

۱۸۸۸ء میں سب جج اور ۱۸۹۴ء میں عدالت خفیفہ کے جج درجہ اول اور سشن جج مقرر ہو گئے۔ اور کئی سال تک ہزار بارہ سو تنخواہ پاتے رہے۔ پھر پنشن پاکر کونہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے لگے۔

۱۸۹۸ء میں گورنمنٹ نے خان بہادر کا خطاب عطا فرمایا۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا۔

شاعری کا انہیں بچپن سے شوق تھا۔ کچھ دنوں مولوی وحید الدین وحید رئیس کٹرہ ضلع الہ آباد سے شاعری کی مشق کرتے رہے۔ ان کی شاعری گوشہ نشینی کے بعد چمکی۔ زمانہ کے عام میلان اور موجودہ معاشرت کی خرابیوں کا جو اثر ان کے دل پر ہوا اس کو ظرافت کے رنگ میں ظاہر کرنے کی راہ انہوں نے ڈھونڈھ نکالی۔

زبان نہایت صاف اور پاکیزہ۔ طرز بیان نہایت دلچسپ۔ عاشقانہ رنگ میں بات پیدا کرنا۔ ان کی طبیعت کا خاص مذاق ہے۔ ہر رنگ میں شعر کہتے تھے۔ سیاسی اور معاشرتی حالات میں آپ کی رائے نہایت درست ہوتی تھی۔ خیالات بھی نہایت سلجھے ہوئے اور اکثر اچھوتے

ہوتے تھے۔

اکبر کے کلام میں خاص بات یہ ہے کہ روشن خیالی کے ساتھ مشرق سے سچی محبت کا وعظ کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر مشرق کے رہنے والے کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت رکھے۔ اپنے مذہب کی حفاظت کرے بزرگوں کا ادب کرے۔ اپنے رسم ورواج کو اس لئے بُرا نہ سمجھے کہ وہ مغربی رسم ورواج کے خلاف ہے۔ بلکہ جہاں تک جائز ہے اپنی چیزوں پر فخر کرے۔ اپنے ماضی سے واقف ہو۔ اپنے حال پر گہری نظر ڈال سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے۔ یہ خیالات اس خوبی کے ساتھ ان کے زمانہ کے کسی شاعر میں نہیں پائے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ قوم نے ان کو لسان العصر کا خطاب عطا فرمایا۔ جو خان بہادر سے زیادہ مشہور ہوا۔

کلام کا نمونہ:۔

پسر کا پیام ماں کے نام

ایک بچہ جس کی ماں کا ہو گیا تھا انتقال

میرے پاس آیا کہیں سے روتا روتا ایک دن
اور کہا روکر کہ ماں کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں میں
کھانا تک کھایا نہیں ہے صاف گذرا ایک دن
چھوڑ کر بیکس خدا جانے کہاں رخصت ہوئی
ہے بہت مشکل مجھے بے ماں کے جینا ایک دن
تم سے مل جائے تو کہنا مجھ کو بھی لیجائے ساتھ
یا چلی آئے وہاں سے رو کے دیا ایک دن
کیسی بستی ہے وہ کیسے گھر ہیں کیسے لوگ ہیں
تو نے تو جاکر وہاں خط بھی نہ بھیجا ایک دن
پیار کرتی منہ دھلاتی کپڑے پہناتی تھی روز
یوں پھٹے کرتے سے میں رہتا نہیں تھا ایکدن
کون چمکاوے مجھے اور کون لے آغوش میں
خواب میں بھی تو نے حال آکر نہ پوچھا ایک دن
اپنے سینہ سے کبھی اک دم نہ کرتی تھی جدا
اب یہ تنہا بیکسی میں کیسے چھوڑا ایک دن
اب نہیں کرنے کا ضد اب کچھ نہ مانگوں گا کبھی
خستہ حالی پر مری آ رحم فرما ایک دن

اب نہیں رونے کا رونے سے خفا ہے تو اگر
اچھی اماں گود میں لے لے مجھے آ ایک دن
تجھ کو بن میرے وہاں کٹتے ہیں کیسے روز و شب
مجھ کو بے تیرے یہاں ہے سو برس کا ایک دن
اے خدا ایسے یتیم و بے نوا پر فضل کر
یہ دعا کی اور اکبر خوب رویا ایک دن

روانی دریا

وہ سودی سخن گوئے شیریں مقال
جو انگریزی شاعر تھا اک باکمال
لکھی اس نے ہے نظم اک لاجواب
دکھاتی ہے شکل روانی آب
جو بہتا ہے پانی میان لڈور
اسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور
مناسب جو انگلش مصادر ملے
مقفیٰ کئے ان کے سب سلسلے
یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن
کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن
دکھاؤں روانی دریائے فکر
کہ گوہر شناسوں میں ہو جس کا ذکر
عجب ہے نہیں ان کی اس پر نظر
کجا میں کجا سودی نامور
سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں
نہیں سہل اس راہ کی منزلیں
مرے پاس سرمایہ کافی نہیں
وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں

زباں میں نہ وسعت نہ ویسا مذاق ادھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق
اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط معانی میں پیدا نہ ہو ربط و ضبط

موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں
مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں

جو تھیں دقتیں کہہ چکا برملا غرض دیکھئے اب یہ پانی چلا
اچھلتا ہوا اور ابلتا ہوا اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا
پہاڑوں میں سر کو ٹپکتا ہوا چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا
وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا یہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا
ٹھپکتا ہوا غل مچاتا ہوا وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا
وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا یہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا
ادھر جھومتا اور مٹکتا ہوا ادھر گھومتا اور اٹکتا ہوا
بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا
وہ اونچے سروں میں تموج کا راگ وہ خود جوش میں آکے لاتا یہ جھاگ
تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا
لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا یہ پھٹتا ہوا وہ سمٹتا ہوا
یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا اترتا ہوا اور چڑھتا ہوا

یہ ہٹتا ہوا اور بچتا ہوا	دباتا ہوا اور کچلتا ہوا
وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا	وہ خاکی کو سیمی بناتا ہوا
گل و خار یکساں سمجھتا ہوا	ہر اک سے برابر الجھتا ہوا
بہاتا ہوا اور بہتا ہوا	ہوا کے طمانچوں کو سہتا ہوا
بلندی سے گرتا گراتا ہوا	نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا
اُبکتا ہوا اور اڑاتا ہوا	اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا
وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا	زمینوں کو شاداب کرتا ہوا
یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا	وہ دھرتی پہ احساں دھرتا ہوا
یہ پھولوں کے گجرے بہاتا ہوا	وہ چکر میں بجرے پھنساتا ہوا
لپکتا ہوا دندناتا ہوا	اُمنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا	سنبھلتا ہوا اور جھلکتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا	حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا
تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا	شعاعوں کے جوبن دکھاتا ہوا
یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں	بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

وہ سودی کا سیلاب آب لڈور

یہ بحر خیالات اکبر کا زور

غزلیں

بہار آئی کھلے گل زیب صحن بوستاں ہوکر
عنادل نے مچائی دھوم سرگرم فغاں ہوکر

بلائیں شاخ گل کی لیں نسیم صبحگاہی نے
ہوئیں کلیاں شگفتہ روکے رنگیں تپاں ہوکر

جوانان چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا
کسی نے یاسمن ہوکر کسی نے ارغواں ہوکر

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحن گلستاں میں
صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگ اذاں ہوکر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے کو
ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہوکر

زبان برگ گل نے کی دعا رنگیں عبارت میں
خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہوکر

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہوکر

بنائے ملت بگڑ رہی ہے۔ ببول پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا اُبھر رہے ہیں

اُدھر ہے قوم ضعیف و مسکیں اِدھر ہیں کچھ مرشدان خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں

کٹی رگِ حیاتِ ملت۔ رواں ہوئیں خونِ دل کی موجیں
ہم اس کو سمجھے ہیں آب صافی نہا رہے ہیں نکھر رہے ہیں

صدائے الحاد اٹھ رہی ہے۔ خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گزر رہے ہیں

جناب اکبرؔ سے کوئی کہہ دے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا فکر کر رہے ہیں

یہ طفل ناداں غریقِ غفلت ہوائے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں

بہار ہی سے نہیں ہیں واقف خزاں کے ظلموں کو کیا وہ سمجھیں
یہ داغ تو ہے انہیں کے دل پر جو محو رنگ چمن رہے ہیں

یہ آخری صف میں آگے والے بہشت سمجھے ہیں اپنے تھالے
محل حسرت ہیں ان کے سینے جو زینت انجمن رہے ہیں

اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر
مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں

رباعیاں

دولت وہ ہے جو عقل و محنت سے ملے
لذت وہ ہے کہ جوش صحت سے ملے
ایمان کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے
عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

ایمان و حواس و حق پرستی کیا ہے
یہ غفلت و کفر و جوش و مستی کیا ہے
لاریب یہ سب ہے ایک ہستی کا ظہور
یہ مجھ سے نہ پوچھ پھر وہ ہستی کیا ہے

انسان چاہے جو بات اچھی چاہے
بدیوں سے محترز ہونے کی چاہ ہے
شیطان سے وہ فلسفی ہے منسوب
جس کا مطلب ہے کہ وہ جو جی چاہے

عالم نے یہاں قبول درد کو جانا

دیکھا دنیا کو نیک، و بد کو جانا
غافل وہ ہے کہ جس نے ہنگامِ عمل
اپنی قوت کو اپنی حد کو جانا

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

ہو علم اگر نصیب تو تعلیم بھی کر
دولت جو ملے اُسے تقسیم بھی کر
اللہ عطا کرے جو عظمت تجھ کو
جو اہل ہیں اس کے ان کی تعظیم بھی کر

اردو میں جو شریک ہونے کے نہیں
اس ملک کے کام ٹھیک ہونیکے نہیں

ممکن نہیں شیخ امر یقیں نہیں!
پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں اُن سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

کہتا ہوں میں ہندو مسلماں سے یہی
اپنی اپنی روش پہ تم ٹھیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

پرچہ رکھا جو اُس نے میں یہ سمجھا
پاکٹ میں یہ بیس روپے کا نوٹ گیا
گھر پر کھولا تو بس یہی لکھا تھا
کیا شعر تھے واہ وا میں لوٹ گیا

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر

نم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں
بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں پوچھتا ہوں تجھے ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

مذہب کی کہوں تو دل لگی ہیں اڑ جائے
مطلب کی کہوں تو پالسی ہیں اڑ جائے
باقی سر قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش
غالب ہے کہ یہ بھی اک صدی میں اُڑ جائے

عمل ان میں ہوا رخصت عقیدہ میں خلل آیا
کوئی پوچھے کہ ان کے ہاتھ کیا نعم البدل آیا
محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اچھل آیا

متفرق اشعار

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ملا ہے ہم کو یہ مضمون روشن چشم بینا سے
کہ چھوڑی جس نے خود بینی اسے سب کچھ نظر آیا

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا
حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا

حلاوت زندگانی کی کہاں اس تلخکامی میں
خدا کا حکم ہے جیتے ہیں اے اکبر مزہ کیسا

یہ کیا کہیں احباب کیا کارنمایاں کر گئے
بی۔اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

اس نے میدان میں سر دیکے کیا قوم کا نام
آپ بنگلے میں منایا ہی کئے جان کی خیر

پارٹی کچھ نہیں جب نہ ہو ذوق طاعت
قوم کی خیر نہیں جب نہیں ایمان کی خیر

شبلی

مولانا شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک مشہور خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ نے منطق۔ فلسفہ اور ادب مشہور ادیب مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی سے پڑھا۔ اور مولوی احمد علی محدث سہارنپوری سے علم حدیث حاصل کیا۔ ۱۷۔ برس کی عمر میں آپ نے درس نظامیہ سے بالکل فراغت حاصل کر لی۔

سمیع اللہ خاں صاحب کی سفارش سے سرسید نے آپ کو کالج کی پروفیسری عنایت کی۔ ۱۶ برس تک آپ وہاں رہے۔ اسی زمانہ میں آپ نے مصر۔ روم و شام کا

سفر کیا + ۱۸۹۴ء کو ۳۷ سال کی عمر میں آپ کو شمس العلما
کا خطاب گورنمنٹ کی جانب سے عطا ہوا + مدت تک الہ آباد
یونیورسٹی کے فیلو رہے +

سرسید کی وفات کے بعد ۱۸۹۸ء میں کالج سے علیحدہ
ہو کر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ سلسلہ آصفیہ سے آپ کے
لئے دو سو روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر ہوا۔ کچھ عرصہ بعد تین
سو روپے ہو گئے۔ مدت تک وہیں رہ کر کتابوں کی تصنیف
و تالیف میں لگے رہے +

حیدر آباد سے آ کر لکھنو میں قیام کیا اور ندوۃ العلما
کے کاموں میں مشغول ہو گئے + ندوۃ العلما کے متعلق ہم
اپنے نثر نگاروں کے تذکرہ میں لکھ چکے ہیں +

آخر عمر میں تمام باتوں کو چھوڑ کر سیرۃ النبی کے لکھنے
میں مشغول ہو گئے + ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو پندرہ دن
دستوں کی بیماری میں مبتلا رہ کر اپنے وطن اعظم گڑھ میں
انتقال کیا +

آپ فرنچ زبان بھی جانتے تھے + آپ کی تصنیفیں بہت
سی ہیں۔ جن کا ذکر ہم اپنے نثر نگاروں کے تذکرہ میں کر

چکے ہیں ٭

شاعری میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ مگر فارسی اور اردو غزلیں زیادہ نہیں ہیں۔ انہوں نے تاریخی اور ملکی نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ ان کا یہ رنگ بہت مقبول ہُوا ٭ واقعات نویسی میں جو کمال آپ کو حاصل تھا۔ اس کی مثال مشکل سے پیش کی جا سکتی ہے ٭ آپ کی مختلف نظموں کا مجموعہ کلام شبلی کے نام سے شائع ہو چکا ہے ٭

کلام نمونہ یہ ہے :۔

عدل جہانگیری

قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نورجہاں بام پہ تھی جلوہ فگن
کوئی شامت زدہ رہگیر اُدھر آ نکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن
غیرت حسن سے بیگم نے طمانچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتہ بے گور و کفن
ساتھ ہی شاہ جہانگیر کو پہنچی یہ خبر

طمنچہ

غیظ سے آگئے ابروئے عدالت پہ شکن
حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جاکے پوچھ آئیں کہ سچ ہے یا غلط ہے یہ سخن
نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حُسن
ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن
اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشورِ حُسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن
مفتیِ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن
مفتیِ دیں نے یہ بےخوف وخطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑا دوں گردن
لوگ دربار میں اس حکم سے تھرا اُٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن
ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جاکر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
یہ وہی نورجہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہ زمن
اس کی پیشانیٔ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نورجہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن
خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن
مفتیٔ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ و زن
وارثوں کو جو دے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن
ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص

قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن
ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبہ حیلہ و فن
اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن
دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

جرأت صداقت

مدتوں حضرت عباس بھی تھے شامل کفر
کم سے کم یہ کہ رسالت پہ نہ تھا ان کو یقیں
بدر میں آکے لڑے اور گرفتار ہوئے
بسکہ تقدیر میں تھی خانہ زنداں کی زمین
قیدیوں کے لئے جو گھر کہ ہوا تھا تیار
اتفاقات سے تھا خانہ زنداں کی زمیں
رات کو حضرت عباس کراہے اکثر
قید کرتے ہوئے لوگوں نے جو مشکیں تھیں کسی

دیر تک سرورِ عالم کو رہی بے خوابی
کروٹیں لیتے تھے اور نیند نہ آتی تھی قریں
وجہ پوچھی جو صحابہ نے تو یہ فرمایا
آتی ہے کان میں عباس کی آوازِ حزیں
جب سنا یہ تو وہیں کھول دئے ہاتھ ان کے
چین سے حضرت عباس نے راتیں کاٹیں
تھا انہیں حضرت عباس کا پوتا منصور
جو کہ ایوانِ خلافت میں ہوا تخت نشیں
ایک دن حکم دیا اس نے کہ اولادِ رسول
ایک جا جمع کئے جائیں جو مل جائیں کہیں
پھر دیا حکم کہ ان سب کو پہنا کر زنجیر
کہہ دو ان سے کہ بنیں خانۂ زنداں کے مکیں
ایک دن سیر کو اس شان سے نکلا منصور
پا بہ زنجیر تھے ساداتِ پسار اور ہمیں
ساتھ ساتھ آتے تھے بیدل جگر و جانِ رسول
اور منصور تھا زیبِ حرمِ خانۂ زیں
ایک نے مجمعِ سادات میں بڑھ کر یہ کہا

گرچہ اس لطف کے مشکور ہیں ہم خاک نشیں
غزوۂ بدر میں لیکن جو کیا ہم نے سلوک
وہ تو کچھ اور تھا۔ ہے یاد بھی تم کو کہ نہیں

غزلیں

پوچھنے کیا ہو جو حال شب تنہائی تھا
رخصت صبر تھی یا ترک شکیبائی تھا
شب فرقت میں دل غمزدہ بھی پاس نہ تھا
وہ بھی کیا رات تھی کیا عالم تنہائی تھا
خون رو رو دلے دو ہی قدم میں چھالے
یاں وہی حوصلہ بادیہ پیمائی تھا
کون اس راہ سے گزرا ہے کہ ہر نقش قدم
چشم عاشق کی طرح اس کا تماشائی تھا
خوب وقت آئے نکیرین جزا دے گا خدا
لحد تیرہ میں کیا عالم تنہائی تھا
ہم نے بھی حضرت شبلی کی زیارت کی تھی
یوں تو ظاہر میں مقدس تھا پہ شیدائی تھا

یار کو رغبت اغیار نہ ہونے پائے
گل تر کو ہوس خار نہ ہونے پائے

اس میں در پردہ سمجھتے ہیں وہ اپنا ہی گلہ
شکوۂ چرخ بھی زنہار نہ ہونے پائے

فتنۂ حشر جو آنا تو دبے پاؤں ذرا
بخت خفتہ مرا بیدار نہ ہونے پائے

ہائے دل کھول کے کچھ کہہ نہ سکوں سوز دروں
آبلے ہم سخن خار نہ ہونے پائے

باغ کی سیر کو جاتے ہو تو پر باد رہے
سبزۂ بیگانہ ہے دوچار نہ ہونے پائے

جمع کر لیجیئے غمزوں کو مگر خوبیٔ بزم
بس وہیں تنگ ہے کہ بازار نہ ہونے پائے

آپ جاتے تو ہیں اس بزم میں لیکن شبلی
حال دل دیکھیئے اظہار نہ ہونے پائے

سرور جہاں آبادی

منشی درگا سہائے نام - سرور تخلص - آپ سمت ۱۹۲۹
مطابق ۱۸۷۳ء کو قصبہ جہاں آباد ضلع پیلی بھیت میں پیدا
ہوئے - ذات کے کایستھ تھے + ابتدائی تعلیم حاصل کرنے
کے بعد شاعری میں مولوی کرامت حسین بہار کے شاگرد
ہوئے + پھر بیان یزدانی کا کلام ان کو بہت بھایا اور
یہ انہیں کے رنگ میں کہنے لگے اور انہی کا اپنے آپ
کو شاگرد سمجھنے لگے +

کچھ عرصہ تک ایک رئیس کے لڑکے کے اتالیق رہے
پھر دو تین سال تک رسالہ زمانہ کے دفتر میں کام کرتے

رہے + شاعری کے ساتھ حکیمی بھی کرتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے ہمیشہ پریشان رہے +

منشی صاحب ہر شخص سے جھک کر ملتے تھے۔ جوان ہی تھے کہ ان کو بیوی اور اکلوتی بیٹی کا صدمہ اٹھانا پڑا + اسی زمانہ میں یہ شراب بھی پینے لگے۔ جو بڑھتے بڑھتے ان کی موت کا سبب ہوئی + ۳ ردسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ ۴۷ برس کی عمر پائی +

آپ کا کلام "جام سرور" کے نام سے آپ کے مرنے کے بعد ہی چھپ گیا +

آپ کا اس زمانہ کے ان شاعروں میں شمار رہے۔ جنہوں نے اردو شاعری کو نئے سر سے زندہ کردیا + نیچرل شاعری کے موجد ہونے کا سہرا اگرچہ پروفیسر آزاد اور حالی کے سر رہا۔ لیکن انہوں نے ایشیائی رنگ کو ایسی دلفریب ترکیب سے ملایا کہ اس میں بے انتہا شیرینی پیدا ہو گئی + طبیعت میں سوز و گداز بہت تھا۔ اس لئے منہ سے جو شعر نکلتا تھا وہ دلوں میں چبھ جاتا تھا + وطن کی محبت اور قومیت کے خیالات ان کی شاعری کی جان

مگر پھر بھی استعاروں سے دور بھاگتے تھے + ان کو غزل گوئی کے عام پسند اور سہل رنگ سے نفرت تھی۔ اخلاق کو خراب کرنے والے مضامین۔ سمجھ میں نہ آنے والی تشبیہیں۔ گل وبلبل اور زلف وکاکل کی پرانی حکایتوں سے یہ دور رہتے تھے + صاف اور سلجھی ہوئی بندشوں۔ عمدہ ترکیبوں سے یہ اپنے کلام کو سنوارتے تھے + آپ کی نظمیں اکثر مشہور رسالوں میں چھپی ہیں۔ غزل گوئی کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی +

نمونہ کے طور پر ان کی چند نظمیں اور ایک غزل ذیل میں درج ہیں :۔

بچپن کی یاد

تیرے ایاغ کا ہوں میں جرعہ خوار بچپن
باقی ہے تیری لے اب تک خمار بچپن
تیرے فراق میں ہوں میں بے قرار بچپن
کرلوں گلے لگا کر آ تجھ کو پیار بچپن
کیوں مجھ سے روٹھ بیٹھا تیرے نثار بچپن

پھر خاک کا گھروندا آنگن میں میں بناؤں
چھوٹی سی اپنی کشتی پانی میں پھر بہاؤں
طفلی کے پیارے پیارے معصوم گیت گاؤں
پھر بانسری بجاؤں پھر جھنجھنا بجاؤں

دو دن کو اے جوانی دیدے ادھار بچپن

وہ عہد بیخودی بھی پروردگار کیا تھا
حسرت کی جب نظر سے ہر شئے کو دیکھتا تھا
نیچر کا جو نظارہ تھا آرزو فزا تھا
قوس قزح کے پیچھے میں دن کو دوڑتا تھا

اور برق پر تھا شب کو میں اشکبار بچپن

تو آئے ہائے طفلی جا کر کہاں یہ ممکن
اور میرے ساتھ کھیلیں میرے رفیق کمسن
تیرا خیال پھر بھی تسکیں فزا ہے لیکن
گلیوں میں دوڑتا تھا کس لطف کے تھے وہ دن

گھوڑے پہ اپنے ہو کر جب میں سوار بچپن

تو نے کئے جوانی طفلی کے کیا کھلونے
وہ میرے ننھے ننھے تسکیں فزا کھلونے

میں جن سے کھیلتا تھا وہ دلربا کھلونے
لادے کہیں سے مجھ کو وہ خوشنما کھلونے
ان پیاری مورتوں کو ہوں بیقرار بچپن
پیارا تھا باپ کا میں اور ماں کا لاڈلا تھا
گھر بھر میں پھول گویا میں اک گلاب کا تھا
صورت بھی دلربا تھی، چہرہ بھی خوشنما تھا
وہ ننھے ننھے تلوے وہ اُبھرا اُبھرا ماتھا
بھولے نہیں وہ تیرے نقش و نگار بچپن
منت کی وہ گلے میں چھوٹی سی آہ ہیکل
کانوں میں ہلکے ہلکے وہ موتیوں کے کنڈل
وہ لمبے لمبے گیسو لٹکے ہوئے مسلسل
وہ سرخ سرخ غازہ بہتا ہوا وہ کاجل
وہ ہائے تیرا جوبن اور وہ سنگھار بچپن
کیچڑ میں وہ پھسل کر گلیوں میں لوٹ جانا
اور میرے ہمسنوں کا وہ قہقہے لگانا
شانہ پکڑ کے میرا آہستہ پھر اُٹھانا
لت پت وہ گھر کو آنا وہ ماں کا مسکرانا

کرتا نیا بدل کر کرنا وہ پیار بچپن!
آ عمر رفتہ آ کر مجھ کو گلے لگا لے
آ اے شباب میری طفلی کے ناز اٹھالے
عمر رواں نے تجھ کو کس کے کیا حوالے
پایا نشاں نہ تیرا او چھپ کے جانیوالے
کھو یا گیا کہاں تو۔ تیرے نثار بچپن
کوئل کی آہ کوکو وقت سحر وہی ہے
نالوں میں بلبلوں کے اب بھی اثر وہی ہے
تیرا بھی او پپیہے سوز جگر وہی ہے
سورج وہی ہے دن کو شب کو قمر وہی ہے
تیرے مگر کہاں وہ لیل ونہار بچپن
تو نے چرا لیا ہے بچپن مرا جوانی
تیری طرف سے ظالم ہے مجھ کو بدگمانی
اک تیرے دم سے طفلی تھا لطف زندگانی
میں غمزدہ سناؤں غم کی کسے کہانی
تو ہی نہیں رہا جب او غمگسار بچپن
داغوں سے میں سجاتا چھوٹی سی تیری خلوت

نالوں کو ساتھ لے کے کرتا طواف تربت
مجھ غمزدہ کی لیکن ایسی کہاں تھی قسمت
چلتا جو میرا قابو تو آہ وقت رحلت
پہلو میں میں بناتا تیرا مزار بچپن

دایہ کی دوش ماں کی آغوش سے جدا ہوں
سڑکوں پہ خاک اڑاتا گلیوں میں لوٹتا ہوں
طفلی کی آرزو! تم سے بچھڑ گیا ہوں
ان پیاری لوریوں کو لب سے ترس رہا ہوں
لے لے شباب دے دے پروردگا بچپن

کوئل

او چمن کی اجنبی چڑیا کہاں تھی آہ تو
کیا کسی صحرا کے دامن میں نہاں تھی آہ تو
تیرے دلکش زمزمے تھے سبزہ زاروں میں خموش
آشیانہ تھا ترا گلشن میں بزم بے خروش
کھینچتی وقت سحر دل کو تری کوکو نہ تھی
چھاؤں میں تاروں کی محو نغمۂ دل جو نہ تھی

موسم سرما میں اے سرمایۂ صبر و شکیب
بے صدا تیرا پس پردہ تھا ساز دلفریب
مرحبا اے پیکر پیک سبک گام بہار
لے کے پھر تو گرمیوں میں آئی پیغام بہار
تو ادھر آئی فضائے گل کا دور آیا اُدھر
تو نے گائے گیت اور آموں پہ مور آیا ادھر
طائرانِ باغ نے چھیڑا ہے ساز انبساط
تیرے مقدم میں ہیں شاخوں پر ہم آہنگ نشاط
پہنی ننھی ننھی کلیوں نے قبائے شبنمیں
آ رہی ہے کان میں تیری صدائے دلنشیں
کوئی انجم آسماں کا او سبک پرواز شوق
رہنما ہے کیا ترا دلدادۂ انداز شوق
تو جو آنے والے موسم کا نشاں پاتی ہوئی
اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہے یوں گاتی ہوئی
تیرے مقدم میں شکیب خاطر ناشاد میں
موسم گل کو بھی دیتا ہوں مبارک بادیں
تو چمن میں اڑ کے کیا آئی کہ آپہنچی بہار

گا رہی ہیں چھوٹی چڑیاں سبز کنجوں میں ملا
سوسن رنگیں ہیں اک دوشیزۂ نا کتخدا
چن رہی ہے ننھی ننھی سرخ کلیاں خوشنما
اور تجھ سے ہم سرود نغمۂ اعجاز ہے
بزم قدرت میں تری گویا شریک ساز ہے
میٹھے نغمے گانیوالی او چمن کی نازنیں
ہے تر و تازہ ہمیشہ تیرا کنج دلنشیں
اور مصفا ہے فضائے آسماں تیرے لئے
ہے شفق جام شراب ارغواں تیرے لئے
تیرے نغموں میں اثر اندوہ و حرماں کا نہیں
سال میں تیرے گزر دور زمستاں کا نہیں
مجھ کو قسام ازل دیتا اگر دو بال و پر
اڑ کے ہوتا میں بھی تیرے ساتھ سرگرم سفر
بن کے ہم دونوں رفیق موسم جوش بہار
کرتے خوش خوش ہر برس گلگشت دشت و کوہسار

اندھی پھول والی کا گیت

لوگو چلو مرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

سنتی ہوں اس زمیں کا ہے منظر نظر فریب
پھر کس طرح نہ ہوں یہ گل تر نظر فریب

بچے یہ پھول بھی تو اسی سرزمیں کے ہیں
یہ ننھے ننھے لال اُسی نازنیں کے ہیں

بازار حسن میں یہ گل تر ابھی ابھی
آئے ہیں ماں کی گود سے اٹھ کر ابھی ابھی

سونا ہوا چمن سے اٹھا لائی ہوں ابھی
پھولوں کی انجمن سے اٹھا لائی ہوں ابھی

لوری تھی خواب نازکی موج ہوا نہ تھی
ماں کی دعا تھی جنبش باد صبا نہ تھی

دلکش ہیں ان کے پھول سے رخسار کے نشاں
کچھ ماں کی مامتا کے ہیں کچھ پیار کے نشاں

آنسو ڈھلک رہے ہیں جو یہ چہرے پہ ماں کے ہیں

خطرہ نہ کیوں یہ شبنم باغ جناں کے ہیں
ان آنسوؤں میں رنگ محبت ہے جلوہ ریز
ان بوندیوں میں شعلہ الفت ہے جلوہ ریز
بچوں کا غم خوشی میں بھی ہے غم نصیب کو
کھٹکا لگا ہوا ہے یہ ہر دم غریب کو
یارب کہیں انہیں نہ کسی کی نظر لگے
ہیں نازنیں انہیں نہ کسی کی نظر لگے
آغوش ناز سے مرے ہوکر اٹھے ہیں یہ
شبنم سے ہاتھ منہ ابھی دھوکر اٹھے ہیں یہ
ہوکر بڑے اٹھے یہ حسیں کس غضب کے ہیں
جھڑتے ہیں پھول خندہ جبیں کس غضب کے ہیں
روتی گلے لگا کے ہے بے اختیار ماں
کرتی ہے ان پر قطرۂ شبنم نثار ماں
شبنم کی بوندیاں ہیں کہ آنسو یہ ماں کے ہیں
سرچشمۂ وفا ہیں یہ قطرے کہاں کے ہیں
تاریک ہے یہ بزم تماشا مرے لئے
ظلمت کدہ ہے محفل دنیا مرے لئے

آنکھوں بغیر سب ہیں مظاہر جہاں کے ہیچ
میرے لئے ہیں آہ مناظر یہاں کے ہیچ

دنیا کی صورتوں کو ہیں دکھیا ترستی ہوں
اجڑی ہوئی صداؤں کی منزل میں بستی ہوں

گویا قریب ساحل ظلمت کھڑی ہوں میں
محو تلاش جلوۂ صورت کھڑی ہوں میں

نکلیں گی ان میں ایسی بھی دو چار صورتیں
صبر آزما۔ حسین۔ طرح دار صورتیں

صورت پہ جن کی خلق خدا ہے مٹی ہوئی
ناز و ادا پہ جن کے قضا ہے مٹی ہوئی

وہ کیسی ہوتی ہوں گی ترستی ہوں میں غریب
دیکھوں نظر اٹھا کے میں ایسے کہاں نصیب

میرا بجز صداؤں کے ہمراز کون ہے
ظلمت کدے میں مونس و دمساز کون ہے

لوگو چلو مرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

کہتے ہیں کیا غریب یہ ان کی صدا سنو

فریاد کو ہے اپنی زباں بھی ذرا سنو
اس اندھی پھول والی کا دم ہے ستم ہمیں
مرجھا کے رہ نہ جائے کہیں ہے یہ غم ہمیں
نازک ہے دھان پان ہے بچی ہے نور کی
پروردہ بہار ہے بچی ہے حور کی
آزاد اس کی قید ستم سے کرے کوئی
دامان شوق میں ہمیں یارب بھرے کوئی
ہم دایۂ بہار کے نور نگاہ ہیں
آنکھیں اس اندھی لڑکی کی بے نور آہ ہیں
مشتاق ہیں ان آنکھوں کے پروردگار ہم
جو ہم کو دیکھیں جن کو دکھائیں بہار ہم
لوگو چلو مرے گل رعنا خرید لو
اس اندھی پھول والی کا سودا خرید لو

غزل

کسی مست خواب کا ہے عبث انتظار سو جا
کہ گزر گئی شب آدھی دل بیقرار سو جا

ابھی دھان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم تجھے گود میں اٹھا لوں
تجھے سینہ سے لگا لوں تجھے کر لوں پیار سو جا

یہ تری صدائے نالہ مجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا مرے رازدار سو جا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہی ہیں لوری مرے غمگسار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے شب غم بری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم۔ دل بیقرار سو جا

چکبست

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء کو فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگوں کا وطن لکھنؤ تھا۔ ابھی یہ چھوٹے ہی تھے کہ فیض آباد سے لکھنؤ چلے آئے اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اسکول کا آخری امتحان دے کر آپ لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخل ہوئے اور وہاں سے ۱۹۰۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان دے کر وکالت شروع کی۔ اس پیشہ میں انہوں نے بہت کامیابی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ آپ کا شمار لکھنؤ کے بڑے بڑے وکیلوں

میں ہوتا تھا۔

۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ میں آپ رائے بریلی تشریف لے گئے عدالت میں بحث کی - اور سہ پہر کو لکھنؤ واپس ہو رہے تھے + اسٹیشن پر آئے ریل میں بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی - ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھ کر انہیں گاڑی سے اتار لیا اور ویٹنگ روم میں لے جا کر لٹا دیا + فوراً ڈاکٹر آیا - اس نے دیکھا - علاج ہوا لیکن اخیر وقت آن پہنچا تھا - کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تمام علاج بیکار ثابت ہوا - ۷ بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا + آپ کے بڑے بھائی رائے صاحب پنڈت مہراج نرائن چکبست ایگزیکٹو افیسر لکھنؤ میونسپلٹی کو تار دیا گیا اور وہ آکر رات کے گیارہ بجے آپ کی لاش موٹر میں رکھوا کر لکھنؤ لے گئے۔

شاعری کا شوق آپ کو بچپن سے تھا - شاید پہلی غزل آپ نے نو برس کی عمر میں کہی تھی - اس زمانہ سے آپ برابر شعر کہتے رہے + استادوں میں آتش - غالب اور انیس کے کلام پر آپ فدا تھے - اسی لئے آپ کی غزلوں سے آتش کا

رنگ جھلکتا ہے اور مسدس میں انیس کا انداز نظر آتا ہے۔
خیالات مختلف ہیں۔ لیکن زبان کی سلاست الفاظ کی بندش
اور ترکیبوں کی خوبی سے انہیں استادوں کی پیروی ظاہر
ہوتی ہے + آپ نے نئے نئے خیالات کو نظم کا جامہ پہنایا
لیکن زبان اور اسلوب بیان سے لطافت اور پاکیزگی کا
جوہر نہیں جانے دیا + ان کا مذاق خاص لکھنو کا ہے اور
یہیں کے ادبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ لیکن ان
کے یہاں گل وبلبل وغیرہ کے مضامین نہیں پائے جاتے
ان کی شاعری کا سبب کبھی حُب وطن کا جوش ہوتا ہے
اور کبھی کوئی پُرانا تاریخی واقعہ ان کو ابھارتا ہے۔ کبھی
قدرت کے نظاروں اور مذہبی باتوں سے وہ اپنی نظم کو
آراستہ کرتے ہیں۔ اور کبھی انسانی جذبات کی تصویریں
کھینچ کر عبرت کا سبق دیتے ہیں۔ قومیت پرستی کے جذبات
ان کے یہاں بہت پائے جاتے ہیں +

نمونہ کلام :-

خاکِ ہند

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسن ازل عیاں ہے
اللہ رے زیب و زینت کیا اوجِ عزّ و شاں ہے

ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاکِ دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیِ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو

سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو

سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے

کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے

حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدا اے بوستاں کو سرو سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نور سحر وطن کا

آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا
تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

راجہ رامچندر کا ماں سے رخصت ہونا

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ خوشخصال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے
کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بیگناہ
نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ
لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ

چہرہ کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا
رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں
میں جانتی ہوں جس لئے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں
لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیجدوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں
لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم
تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونکدے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگادوں گی راج کو
سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ
منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ

اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل کرے
آساں مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز
اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز
لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جاں سے بیکس گذر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ سکے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجئے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر اک رنگ میں ہے شکر کردگار

تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں
اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرتے ہیں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں
اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں
ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں
وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح
لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار

موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار

وہ ابر و برف و باد میں رہتے ہیں بیقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو رب کریم کا
موج سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کار ساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بیخبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

غزلیں

کسے معلوم ہے کیا رنگ بدلے اب فغاں اپنی
خدا حافظ ہے دل کا بند ہوتی ہے زباں اپنی
گلوں نے باغ چھوڑا تنگ آکر جور گلچیں سے
چمن ویراں ہوتا ہے خبر لے باغباں اپنی

فغانِ دردِ دل پر بھی گماں ہے بد زبانی کا
ستمگر سن نہیں سکتا ہے شاید داستاں اپنی

کہیں تو کیا کہیں یا چپ رہیں مظلوم حیراں ہیں
بیاں کرتے ہیں وہ اپنی زباں سے خوبیاں اپنی

فریبِ زندگی جس نے نہ دیکھا ہو مجھے دیکھے
نہ سینے میں ہے دل اپنا نہ منہ میں ہے زباں اپنی

صدا دیتا ہے یہ میرا گریباں چاک ہونے پر
ہزاروں پیرہن پیدا کریں گی دھجیاں اپنی

ہزاروں آرزوئیں داغ بن کر دل میں پنہاں ہیں
کہ جن کا نام لیتے سے لرزتی ہے زباں اپنی

نہ بدلی ہے نہ بدلے گی نزاکت اپنی طبیعت کی
دکھائے گا کہاں تک آسماں نیرنگیاں اپنی

اڑا کر صحن گلشن سے مٹا کر آشیاں میرا
میرے سایہ کے پیچھے پھر رہا ہے باغباں میرا

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے
وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

ہجوم بیکسی ہے شام تنہائی ہے اور میں ہوں
صدائے چارہ گر برہم نہ کردے یہ سماں میرا

تہ و بالا کیا ہے گردش اعمال نے مجھ کو
نہ دشمن ہے زمیں میری نہ دشمن آسماں میرا

نہ اگلی تازگی ہے اور نہ جدت ہے جوانی کی
پرانا ہو گیا افسانۂ عمر رواں میرا

سفر میں زندگی کے سو گیا ہوں تھک کے منزل پر
اجل کے نام سے بدنام ہے خواب گراں میرا

چمن کو چھوڑ دوں یہ بدنصیبی کا اشارہ ہے
وہی مرجھا گئی جس شاخ پر تھا آشیاں میرا

اسیری میں زباں سے میری سن کر راز آزادی
گریباں پھاڑ کر سر دھن رہا ہے پاسباں میرا

الٰہی خیر ہو کیا سرگزشت دل سنائے گا
لرزتا ہے مری آنکھوں میں کیوں رشک رواں میرا

شوق قدوائی

منشی شیخ احمد علی شوق قدوائی ۱۸۵۲ء میں لکھنؤ کے قصبہ جگور میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں مختلف استادوں سے عربی اور فارسی کی تعلیم پاتے رہے۔ بدایوں کے اسکول میں انٹرنس تک انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کی۔ لیکن اٹھارہ ہی سال کی عمر میں تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اور یہ وطن واپس آگئے ؎

کچھ مدت فکر معاش میں پریشان رہے۔ آخر ملازمت مل گئی۔ فیض آباد میں کچھ عرصہ تک عہدۂ تحصیلداری پر مامور رہے۔ لیکن یہ مشغلہ کچھ طبیعت کے مطابق نہ تھا۔ اس لئے استعفےٰ داخل کر کے لکھنؤ چلے آئے۔ اور یہاں

سے اخبار آزاد نکالا۔ جس میں زیادہ تر ادبی مضامین درج ہوتے تھے۔

چند سال بعد مجبوراً یہ مشغلہ بھی چھوڑنا پڑا اور بھوپال میں سرکاری ملازمت قبول کرلی۔ عرصے تک ریاست میں رہے۔ اور آخر وہیں سے پنشن پائی۔ بھوپال سے پنشن پا چکنے کے بعد رامپور کے کتب خانہ میں ملازم ہوگئے۔ اور وہاں ۱۰ سال تک ایک لغات مرتب کرنے کا کام سرانجام دیتے رہے۔ آخر جب ضعف و علالت کے باعث کام کرنا دشوار ہوگیا۔ تو یہاں سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اور آپ استعفےٰ دے کر خانہ نشین ہوگئے۔

اس کے دو سال کے بعد استسقا کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ اور اسی مرض میں مئی ۲۵ء میں بمقام گونڈہ آپ نے وفات پائی۔

شوق نے غزل کے علاوہ مثنوی۔ نظمیں۔ رباعیاں۔ قصیدے۔ مسدس اور مخمس بھی کہے ہیں۔ اور قاسم و زہرہ ایک ڈراما بھی نظم ہی میں لکھا ہے۔ آپ کی تصنیفات میں مثنوی ترانۂ شوق اور مثنوی میں عالم خیال بہت مشہور

ہیں۔ حال ہی میں آپ کا دیوان بھی شائع ہوا ہے۔
جس میں غزلوں کے علاوہ چند رباعیاں اور اخلاقی نظمیں
بھی شامل ہیں۔

شوق کے کلام میں لکھنوی شاعری کا رنگ زیادہ
پایا جاتا ہے۔ ہونا بھی تھا۔ کہ ان کی پیدائش اور تعلیم
و تربیت لکھنؤ ہی کے آس پاس ہوئی۔ اور تعلقات
بھی لکھنوی رنگ کے شعرا ہی سے رہے۔ آپ کے
استاد منشی مظفر علی اسیر تھے۔ جنہوں نے رام پور میں
لکھنوی رنگ کی شاعری میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ شوق
انیس سال کی عمر میں ان کے شاگرد ہو گئے تھے۔ اسیر
کے علاوہ امیر مینائی سے آپ کے بے حد تعلقات تھے۔
امیر مینائی بھی اسیر ہی کے شاگرد اور شوق قدوائی کے
عزیزوں میں سے تھے۔ ان تمام حالات کی وجہ سے ان کی
شاعری میں لکھنوی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے کلام پر اردو کی جدید
شاعری کا اثر بھی پڑتا رہا۔ اور لکھنوی شاعری کا ابتذال
اور لفظی رعایتوں کا خیال رفتہ رفتہ کلام میں سے دور ہوتا گیا

لکھنویوں کی طرح انہوں نے لمبی لمبی غزلیں کہنی بھی چھوڑ دیں - ان کی بعد کی غزلیں مختصر ہیں - ان کا انداز بیان سادہ ہے - اور ان میں اثر و تاثیر ہے *

ان کی مثنوی عالم خیال اردو میں بڑی قابل قدر چیز ہے اس میں ایک ہندوستانی عورت کے جذبات جس کا شوہر پردیس میں ہے نہایت سادگی - بے ساختگی اور روانی سے بیان کئے گئے ہیں + تمام مثنوی اضافتوں سے یکسر خالی ہے + شوق زبان کے بہت بڑے ماہر تھے - ان کے کلام میں زبان کا لطف جا بجا نظر آتا ہے - عروض سے بھی بخوبی واقف تھے چنانچہ اشعار چچے تلے ہیں *

اب ہم شوق کے کلام کا انتخاب یہاں درج کرتے ہیں + پہلے مثنوی ترانۂ شوق کا ایک حصہ - پھر مثنوی عالم خیال کا ایک ٹکڑا - اور اس کے بعد نظمیں درج کی جائیں گی - ان کے مطالعے سے شوق کے کلام کا انداز اور اس کی خصوصیتیں بخوبی ذہن نشین ہو سکیں گی *

مثنوی

بگڑی صفت مزاج سب سے
کہنے لگی جوشش غضب سے

طوطا صیاد نے اڑایا
چڑیاں رہیں چپ اڑیں خدایا

پھرے پہ یہ شجر کھڑے تھے
کانٹے رستے ہی میں پڑے تھے

سوسن کی زباں کیا تھی بے حس
کیا پھوٹ گئی تھی چشم نرگس

کیا باغ میں سو رہا تھا سویا
کلیاں نادان ہی تھیں گویا

شاخوں نے نہ برچھیاں لگائیں
پتوں نے نہ تالیاں بجائیں

پھیلائے ہوئے تھیں جال بیلیں
چلنے دیتیں نہ چال بیلیں!

غنچوں کو حجاب کی پڑی تھی
سبزے کو خواب کی پڑی تھی

میرے آیا نہ خاک کام سنبل
مٹ جائے بلا سے نام سنبل

پکڑا کسی خار نے نہ داماں
زنجیر بنا نہ عشق پیچاں

سنتی ہوں ہوا تو گشت میں تھی
شاید اس وقت دشت میں تھی

تاکا نہ تعارو کو تو نے او تاک
آنکھوں میں پڑی تھی اڑ کے خاک

تو نے نہ دیا نسیم جھٹکا
کانٹا بھی تو پاؤں میں نہ کھٹکا

کس سوچ میں تھے یہ سر جھکائے
کچا کوئی ان پھلوں کو کھائے

انگور رہیں مے پرست کمبخت
یکسر تیرے ہونگے مست کمبخت

لب کھول کے حوض کیوں نہ بولا   فوارے نے کیوں دہن نہ کھولا

موجیں دوڑیں نہ ہو گئے بیتاب   طوق گردن ہوا نہ گرداب

غافل رہے سب حباب جُو کے   کیا تھے نہ شریک آبرو کے

سایہ ہی نہ پڑ کے کاش ہوتا   بیلا ہی گلے کا ہار ہوتا

قمری کو کو سے ٹوک دیتی   انگور کی ٹٹی روک لیتی

مہندی ہی جکڑتی ہاتھ پاؤں   رنگت ہی پکڑتی ہاتھ پاؤں

آگاہ مجھے یہ مور کرتے   سر پر چاتے شور کرتے

آنے والی نسیم ہے بس   جانے والی شمیم ہے بس

ہے لوث سے پاک ان کا دامن   پکڑے خاک ان کا دامن

غنچوں کو جو کچھ کہوں تو چٹکیں   کانٹوں کا جو نام لوں تو کھٹکیں

پھولوں کو جو کہوں تو منہ پھلائیں   چڑیوں سے جو بولوں غل مچائیں

پھر کون ہے جس پہ کچھ گماں ہو   مہندی کا جو چور ہو تو ہاں ہو

کیا سمجھی تھی میں یہ گل کھلے گا   گلشن سے یہ پھل مجھے ملے گا

نارنجی لگا کے رنج جھیلا   تقدیر سے کچھ پھلا نہ کیلا

پاجی ہیں یہ سب شریف سڑ جائیں   بیری ہوئی بیر کیڑے پڑ جائیں

اس نے بھی نہ خاک ادا کیا حق   پالا پالک کو میں نے ناحق

میٹھے سے کھٹائی میں پڑی ہیں   نیچا کھا جاؤں گی ابھی ہیں

بوٹے ہیں یہ دیکھنے کو چھوٹے | یہ جتنے چھوٹے ہیں اتنے کھوٹے
لالہ گمراہ ہے یں سمجھی | دل اس کا سیاہ ہے میں سمجھی
امید بہی سے بھی ہے خام | رکھے آسیب سیب کا نام
گلشن پہ پڑے الٰہی پالا | لالے کا چمن میں منہ ہو کالا
ہنستے ہیں یہ گل تباہ ہو جائیں | یہ فاسے روسیاہ ہو جائیں
ہو سرو کا پاؤں شل الٰہی | دنیا میں نہ پائے پھل الٰہی
اجڑے جب پیڑ سے چمن تو | ہو جائے سفید یاسمن تو
سڑ سڑ کے ثمر گریں تو خوش ہوں | کٹ کٹ کے شجر گریں تو خوش ہوں
یارب سبزے پہ اوس پڑ جائے | پامال ہوں خار بیل اجڑ جائے
مٹ جائے حباب بے نشاں ہو | یہ سرو چمن رواں دواں ہو
پیڑوں کے سروں پہ برسیں پتھر | جھاڑو پھر جائے اس روش پر
چھاتی پھٹے چر کے کھائیں گہرے | غنچے گونگے ہوں پھول بہرے
ٹھنڈی ہوں حوض تو جو گر جائے | پانی تیری آبرو پہ پھر جائے
چوسوں گی انار کا لہو آج | گیندے کو کرونگی سرخرو آج
کاٹوں گی یہ پیڑ جس طرح ساگ | مہتابیوں میں لگاؤں گی آگ
او تخم بگاڑ دوں گی تجھ کو | بس کھود کے گاڑ دونگی تجھ کو
انگور کی کھینچ لوں گی کھال آج | سنبل کے نوچ لونگی بال آج

شبو تری ناک کاٹ لوں گی ۔۔۔ لیموں تجھے آج چاٹ لوں گی
اشجار تنے کھڑے ہیں بدذات ۔۔۔ کھودوں انکی جڑیں تو ہے بات
کیا چڑیوں کو کھاؤں گی میں ۔۔۔ دنیا سے انہیں اڑاؤنگی میں
ناچیں کتنا ہی بن کے طاؤس ۔۔۔ ہیں سبز قدم چمن کے طاؤس
ناچ اتنا نچاؤں جتنی کد ہے ۔۔۔ دوں داغ پہ داغ نو سند ہے
کیا کیا نہ ستم کروں گی واللہ ۔۔۔ مہندی کو قلم کروں گی واللہ
دور ہو شبنم کہیں فنا ہو ۔۔۔ آگے سے نسیم تو ہوا ہو
چھاتی تیری پھٹ جائے او گل ۔۔۔ اللہ کی مار تجھ پہ سنبل
قمری کے گلے میں طوق ڈالو ۔۔۔ کانٹے یہ کھٹکتے ہیں نکالو
فواروں کے لوٹ لوں خزانے ۔۔۔ موجوں کے لگاؤں تازیانے
پیسوں مہندی کو میں جو بس ہو ۔۔۔ تلووں سے ملوں جو دسترس ہو
لُوکا لگے جھاڑ میں تو خوش ہوں ۔۔۔ پتے جلیں بھاڑ میں تو خوش ہوں
یہ پیڑ نہ ہوں نہال یارب ۔۔۔ سبزہ رہے پائمال یارب
اچھا پازیب کیوں نہ بولی ۔۔۔ کیوں آنکھ نہ آرسی نے کھولی
کیا منہ میں بھرے ہوئے تھے گھنگھرو ۔۔۔ چپ تھے کہ مرے ہوئے تھے گھنگھرو
منہ کھولے رہے ۔ مگر نہ بولے ۔۔۔ جوتی سے کڑے اگر نہ بولے
آویزے ہے نہ کس کے ڈر سے ۔۔۔ کیوں نکلے نہ نگینے گھر سے

پھلوں کا پلا نہ جوڑ افسوس
توڑے سے نئے کیا نہ توڑ افسوس

طائر چپکے سے یوں نکل جائے
پھر کون اسے سر چڑھا کے پھل پائے

یہ بھی نہ ہوئے دستگیر افسوس
دل کیوں نہ ہو کنگنوں سے مایوس

ایسے میں نہ آئیں کام گونجیں
منہ موڑ گئیں تمام گونجیں

مالا میرا جو یار ہوتا
دشمن کے گلے کا ہار ہوتا

بجلی ہی چمک کے پھونک دیتی
چوڑی ہی لپک کے ہاتھ لیتی

سونے والے ہیں یا تو پالے
یا ہیں بالا بتانے والے

نادانی سے یہ بھی کر گئے بیر
موتی یتیم ہیں کیا کروں خیر

بس بوئے وفا نہیں کسی میں
کانٹا سی چبھی ہے کیل جی میں

مِسّی نہیں منہ لگانے والی
صورت نہ دکھائے کالی کالی

اشجار سے کھینچ کے تن گئی وہ
جالا مکڑی کا بن گئی وہ

بگڑی بوٹوں سے داغ کھا کر
روٹھی پھولوں سے منہ پھلا کر

ایسی کنگھی سے الجھی وہ گل
الجھے شانے سے جیسے کاکل

ڈھونڈھ آئی اِدھر اُدھر بھی
طوطے کا نہ پایا ایک پر بھی

روئی چلائی غل مچایا
سر پر سارا چمن اٹھایا

سناٹے میں تھے سب اہل گلشن
چپ تھی گونگے کی طرح سوسن

شمشاد کھڑے رہے کنارے
بولے نہ طیور ڈر کے مارے

اترا صدمے سے چہرۂ گل — چھلکے ماتم میں ہو گئے سنبل
نرگس ہوئی کھا کے خوف بیمار — کانٹے ہو گئے سوکھ گئے خار
پتا تھا تو زرد ہو گیا تھا — پانی تھا تو سرد ہو گیا تھا
اوس قسمت کو رو رہی تھی — گل کا دامن بھگو رہی تھی
موجیں لب جو پٹکتی تھیں سر — گرداب کی عقل میں تھا چکر
حیرت تھی کہ تھر ڈھا گیا کون — آخر طوطے کو کھا گیا کون

گر پڑ کے بہ شکل اشک دیدہ
بے ہوش ہوئی ستم رسیدہ

خط کو ہے بیسواں دن آج آئیں گے وہ ضرور ہی
کیا میں کھنچی رہوں اُن کی نظر سے دور ہی
ان کی صدا سنے تو پھر ہو نہ سکے جگر سے صبر
پا کے انہیں کبھی نہ ہو ترسی ہوئی نظر سے صبر
کیا میں جگر کو تھام لوں کیا میں نظر کو پھیر لوں
کیا وہ اُدھر سے آئیں تو رُخ میں اُدھر سے پھیر لوں
ان کی کشش میں آ کے رخ پھر نہ سکے تو کیا کروں
دل سے کروں تو ز در میں دل جو تھکے تو کیا [illegible]
اور اگر نہ آئے وہ ہائے یہ [illegible] تم کا ہے

آ میرے دل میں رو امید وقت ترے کرم کا ہے
شک سے پڑی ہیں سوچ میں ڈرتی ہوں یاس آنہ جائے
اُس سے چڑھی ہوئی ہوں میں وہ مرے پاس آنہ جائے
آتے ہی یاس کا خیال کانپ اٹھی ہوں ڈر کے میں
در نہیں دل میں ورنہ آج بیٹھتی بند کر کے میں
یاس سے ہوں جلی ہوئی اس کو میں جھونکوں بھاڑ میں
ہٹ مرے دل سے او شک آج یاس ہے تیری آڑ میں
آئیں گے یا نہ آئیں گے دل مرا کاش بول دے
ناخن اگر ہے تو یہ شک کی گرہ کو کھول دے
بول اٹھا وہ میرا دل کہتا ہے آ رہے ہیں وہ
میرے لئے بہت سا چین تحفہ میں لا رہے ہیں وہ
دیکھ رہی ہوں آرسی چہرے پہ رنگ آ گیا
دل نے کیا ہے سرخ رو وا نہ کہاں سے پا گیا
دل کو ملا کہاں سے رنگ اس کو ملا امید سے
پائے گا یہ کچھ اور بھی آج ہی اُن کی دید سے
کل مرے سر میں تھا جنوں آج ہے کچھ غرور سا
کل مرے دل میں تھا ملال آج ہے کچھ سرور سا

اپنے لبوں پہ بار بار پاتی ہوں میں تبسم آج
خوش رہو اسے مرے لبو کہتے ہو اور کچھ نہ تم آج
گھر کی زمین جاگ اٹھی صحن پہ نور چھا گیا
آئیں گے وہ ضرور ہی مجھ کو یقین آ گیا
ناچ رہا ہے خوب آج سن کے ہوا ہے مور خوش
اس کو بھی مل گئی خبر پھرتا ہے کیا چکور خوش
آ کے پپیہے پیڑ پر اب جو کہیں گے پی کہاں
ان سے کہوں گی ہنس کے میں بیٹھے ہیں دیکھو پی یہاں
دل تو خفا نہیں مگر میری نظر جھکی رہے
بعد کو بات چیت ہو پہلے زباں رکی رہے
پا کے انہیں رکے زباں اس میں کہاں یہ ضبط ہے
اس کو تو بول چال میں ان کی زباں سے ربط ہے
بننے کو میں تنوں مگر بن بھی سکوں گی یا نہیں
تننے کو میں تنوں مگر تن بھی سکوں گی یا نہیں
بن کے شگفتگی خوشی رخ سے جو کھل پڑے تو پھر
لطف کے ساتھ کر کے میل ان سے نظر لڑے تو پھر
ہونٹھ تو میرے بس کے ہیں انکو سکھاؤں جنگ میں

لیکن اڑاؤں کس طرح رُخ سے خوشی کا رنگ میں
ترسی ہوئی ہیں پتلیاں چین سے کب یہ رہ سکیں
شوق سے بیقرار ہوں گرچہ یہ کچھ نہ کہہ سکیں
دل یہ کہے گا میل کر لب یہ کہیں گے بول دے
حسن کہے گا ہاتھ سے تو مرے رخ کو کھول دے
آپ ہی بڑھ چلیں گے پاؤں آؤں گی ہٹ کے سامنے
لائیں گی شوخیاں مجھے گھونگھٹ الٹ کے سامنے
شکل کشش کی بن پڑی دل کو جو روک تھام لوں
صبر کی دل میں ٹھان لوں جبر سے دل پہ کام لوں
بن کے بلا ہیں ان کے سر آج پڑوں ضرور ہی
دل میں ہنسا کروں مگر منہ سے لڑوں ضرور ہی
خط میں گلے میں لکھ چکی اور گاؤں میں لطف ہے
ہو گی مزے کی نوک جھونک گرچہ دلوں میں لطف ہے
آنکھ مری جو اٹھ ہی جائے جلد نظر کو پھیر لوں
صرف نظر ہی کو نہیں بلکہ میں سر کو پھیر لوں
آئیں جو رخ کی سمت وہ ہاتھوں سے منہ چھپاؤں میں
جھانک کے انگلیوں سے ہاں دیکھوں جو دیکھ پاؤں میں

دانت مرے دبائیں گے تا کہ رہے زبان بند
کچھ وہ کہیں تو انگلیاں اٹھ کے کرینگی کان بند
ایک پلک سے دوسری بند رہے ملی رہے
جیسے انار کی کلی سوکھ کے بے کھلی رہے
نیچے کے لب میں دانت ہوں اور نظر زمیں پہ ہو
ہاتھ مرے جگر پہ ہو اور شکن جبیں پہ ہو
میرے لبوں پہ گر ہنسی آئے گی چھیڑ چھاڑ میں
ہاتھ میں لیکے پنکھیا منہ کی کردں گی آڑ میں
لب نہ ہلیں خدا کرے میں جو انہیں ہلاؤں بھی
ان سے ملیں نہ چتونیں میں جو انہیں ملاؤں بھی
سر کو میں اٹھاؤں بھی تو نہ اٹھے جھکا رہے
دل کو میں بڑھاؤں بھی تو نہ بڑھے رکا رہے
کچھ جو وہ دیں تو یوں نہ لوں لوں تو نہیں نہیں کیے بعد
لاکھ رکاوٹوں کے بعد - لاکھ چنیاں چنیں کے بعد
بول اٹھوں تو ہو جدا ان سے روش زبان کی
وہ جو کہیں زمین کی - میں کہوں آسمان کی
وہ مرے خط کی چٹکیاں یاد دلائیں گے مجھے

چھیڑنے کو ہنسیں گے خود اور ہنسائیں گے مجھے
مکر سے بدگماں بنوں اپنی ہی رکھوں ٹیک میں
لاکھ نہیں نہیں کروں ان کی نہ مانوں ایک میں
دل جو نہ مانے تو انہیں ترچھی نظر سے دیکھ لوں
ہے کواڑ میں دراڑ جا کے اُدھر سے دیکھ لوں
مجھ سے وہ مانگیں یا نہیں دونگی ضرور پان میں
پھیر کے منہ بڑھاؤں گی ہاتھ سے خاصدان میں
میری دغا کے جال میں کیا وہ الجھ ہی جائینگے
صاف ہیں دل کی عورتیں یہ وہ سمجھ ہی جائینگے
آئی لبوں پہ وہ ہنسی یہ کہیں اور ہنسائیں تو
لاکھ دباؤں میں مگر لب مرے کھل ہی جائیں تو
دل میں جو گدگدی سی ہو رُک نہ سکے سکھی ہنسی
باتیں ہی یہ ہنسی کی ہیں آنے لگی ابھی ہنسی
اُنہہ ۔ مجھے اس کا سوچ کیا دل میں تو پیچ ہے نہیں
اپنی وفا کو چھوڑ دے دل مرا ایسی شے نہیں
دل میں بسے ہوئے ہیں وہ اس میں خیال انہیں کا ہے
دل مرا ہے وہ آئینہ جس میں جمال انہیں کا ہے

پھیلے ہیں روح بن کے وہ میرے تمام جسم میں
میری حیات ہیں وہی جان ہے نام جسم میں
او مرے دل کشش کچھ اور تا کہ وہ کھنچ کے آہی جائیں
میں انہیں جلد پا ہی جاؤں وہ مجھے جلد پا ہی جائیں
جنگ کو ہو رہی ہے دیر اور وہ مزے کی بات ہے
دل کو لبھائے ناز سے حسن کی یہ بھی گھات ہے
اب تو یہ فکر ہے کہ آج کچھ تو سنگار چاہیئے
ٹوٹ گیا ہے کل بُلاق سونے کا تار چاہیئے
شوق کے پاس بھیج دوں ایک ذرا سا تار کیا
دام نہ لیں وہ تو نہ لیں تار کا ایسا بار کیا
ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں کم ٹوٹ کے گر گئیں کئی
آئیں گے اب بڑے میاں ان سے منگاؤنگی نئی
مجھ کو بھی سادگی پسند ان کو بھی سادگی پسند
پہنوں گی سپید ہی لباس ہوگا انہیں یہی پسند
بیلیں ہوں یا ہوں بوٹیاں چھپتی ہیں کامدانیاں
چند دوپٹے پھاڑوں رکھی ہیں جامدانیاں
بیل کٹاؤ کی ابھی چوک سے میں منگا نہ لوں

لائی ہے اچھی ایک بیل اس کو بھی لوں میں یا نہ لوں
بیل چکن کی ہے مگر کچھ بھی نہیں ڈھلی خراب
ایک تو شربتی بُری دوسرے تیپچی خراب
کس سے منگاؤں بیل میں سب سے خفا ہیں دیور آج
لڑکے گئے دلہن سے وہ بگڑے ہوئے ہیں تیور آج
کیوں نہ کہوں بوا سے میں خود وہ بنا تی ہیں کٹاؤ
چوک سے لینی آئے وہ جائے جو لینے نان پاؤ
ہار میں گوندھ لوں اگر پھول ہوں خانہ باغ میں
اب کے برس تو موگرا گھر میں کھلا نہ باغ میں
ہو ہی رہے گا یہ تو سب مجھ کو خیال ایک ہے
ساس چپ اور زبان چپ نند ضرور نیک ہے
اس کی سی بس کی گانٹھ اور کوئی نہ ہوگی شہر میں
رکھی ہے منہ میں اک چھری اس نے بجھا کے زہر میں
جب وہ جلن سے لال ہو گال ہوں گرم دو توے
خود تو ہے لہسن اور دانت جیسے چھلے ہوئے جوے
دیکھ کے یہ چمک دمک وہ مرے روپ سے جلے
ریت میں کوئی جس طرح جیٹھ کی دھوپ سے جلے

آج مجھے بھی ہے گھمنڈ لمنتر کا کچھ بھی غم نہیں
اس کو جو ہے کسی پہ ناز میں بھی کچھ اس سے کم نہیں
بیتی ہے دل میں چٹکیاں کرتی ہے دل کا خون وہ
لاتی ہے گھر سے اپنے ساتھ میرے لئے جنون وہ
اے لو سنور آ گئے بنا ری سنورتی ہی رہی
بن نہ پڑا سنگار کچھ حوصلہ کرتی ہی رہی

بندھیاچل کی چاندنی رات

چاندنی رات اور بندھیاچل کا جنگل پر فضا
مالوے کی شب کہ گرما میں بھی سرد اس کی ہوا
چاندنی کا صاف ستھرا فرش صحن کوہ پر
سایۂ اشجار سے چھٹکے ہوئے اس پر شجر
چاندنی کے پھول روشن چاندنی کے نور سے
چاندنی ایسی کہ تم پتوں کو گن لو دور سے
گر رہا ہے کوہ پر جھرنوں سے پانی جا بجا
دے رہی ہے لطف نہروں کی روانی جا بجا
چاندنی کے نور سے شفاف نہروں کی چمک

چاند کے پرتو سے ان نہروں میں لہروں کی چمک
برگ برگ نخل کو جنبش میں لاتی ہے ہوا
ڈالیوں کو دے کے جھٹکے پھل گراتی ہے ہوا
پھول پھل سب ہل رہے ہیں وجد میں آئے ہوئے
پیڑ جتنے ہیں کھڑے ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے

سبز سبزہ جا بجا ہے ۔ لالہ لالہ جا بجا
ان سے پتھر بھی عیاں ہے کالا کالا جا بجا
جا بجا پھولوں کے غنچے جا بجا بیلوں کے جال
جا بجا کھولے ہیں برگد کی جٹائیں اپنے بال

وہ پپیہے کی صدا جو کہہ رہا ہے پی کہاں
کوئل اب بولی ۔ خدا جانے یہ اب تک تھی کہاں
ہاں میں سمجھا ۔ ہوگی یہ آموں کے باغوں میں کہیں
اس دم آ نکلی مگر جنگل سے لطف اس کو نہیں

کوئی نیچی کوئی اونچی ہر پہاڑی مختلف
شکل میں پھیلاؤ میں جھاڑی سے جھاڑی مختلف
شہرے اڑتے پھرتے ہیں پیڑوں پہ پھل کھاتے ہوئے
جا رہے ہیں زاغ اڑتے اور بل کھاتے ہوئے

وہ اُدھر سرخاب پانی میں پڑے ہیں دیکھنا
وہ کنارے پر تلے سارس کھڑے ہیں دیکھنا
گونج اٹھتا ہے پہاڑ ان سارسوں کے شور سے
تھوڑی تھوڑی دیر میں بول اٹھتے ہیں کیا زور سے

جانور جنگل میں آتے ہیں نظر پھرتے ہوئے
پہنچے کھانے کو ثمر دیکھے جہاں گرتے ہوئے
پیتے ہیں چشموں کا پانی لیکن اندیشہ کے ساتھ
خوف ہے ان کو کہ پڑ جائیں نہ یہ شیروں کے ہاتھ

ہیں ستارے تو بہت لیکن درخشاں چند ہیں
چاندنی کے نور کی چادر میں پنہاں چند ہیں
نیلگوں رنگ سما اس پر ستارے جلوہ گر
جیسے آئیں بلبلے جمنا کے پانی پر نظر

چاند پھرتا ہے زمیں کے گرد کس انداز سے
کوئی خوشرو جس طرح ٹہلے ادا سے ناز سے
ہے زمیں سے اُنس اسے گو فاصلہ پر ہٹ گیا
یہ زمیں کے دل کا ٹکڑا ہی تو ہے جو کٹ گیا
کون گھر جائے بھلا منہ اس ہوا سے موڑ کر

میں نہیں جانتے کا شوق ابھی فنا کو چھوڑ کر

ایک حسین لڑکی

چہرہ یہ پیارا پیارا آنکھیں یہ کالی کالی
لب گل کی پتیاں ہیں صورت ہے بھولی بھالی
نازک بدن ہے اس کا با نخل گل کی ڈالی
چہرہ کا رنگ دیکھو کہہ دو کہ پھول والی
رخ پر جو آرہی ہیں اڑ کر لٹیں ہوا سے
سرکا رہی ہے ان کو کس ناز سے ادا سے
ناز اس کے قدرتی ہیں ان سے ہے بے خبر خود
دلکش نظر ہے لیکن واقف نہیں نظر خود
بالوں میں بن رہے ہیں گھونگھر ادھر اُدھر خود
وارفتہ ہو رہا ہے حسن اس کی شکل پر خود
وارفتگی تو دیکھو بے خود ہے کس قدر یہ
آنچل زمیں پہ لوٹا لیکن ہے بے خبر یہ
چوٹی نہیں بندھی ہے بال اڑتے ہیں ہوا سے
بندے الجھ گئے ہیں بالوں میں تو بلا سے

بالوں پہ جمتی ہے گرد اڑ اڑ کے جا بجا سے
سر پہ چمک رہے ہیں ذرّے ذرا ذرا سے
کرتا کریپ کا ہے کانٹوں پہ ہے وہ اُلجھا
دامن پھٹا وہ دیکھو کھینچا جو دے کے جھٹکا
کرتے کو دیکھ کر یہ پہلے تو مسکرائی
پھر کچھ جو دھیان آیا حیرت سی رخ پہ چھائی
پوچھے گی ماں کہاں سے کرتے کو پھاڑ لائی
یہ ڈر نہیں تو چھوٹی چہرہ پہ کیوں ہوائی
کرتے کو دیکھتی ہے کانٹوں کو دیکھتی ہے
ماں سے یہ کیا کہے گی بس سوچ اسے یہی ہے
ٹہلی پھر اٹھ کے اب کچھ تسکین پا رہی ہے
رنگت اڑی ہوئی پھر چہرہ پہ آ رہی ہے
چھوٹی سی آرسی کو نظروں میں لا رہی ہے
خود منہ چڑھا رہی ہے خود مسکرا رہی ہے
لائی ہوا جو اپنے دامن میں گرد بھر کے
آنچل میں منہ چھپایا آنکھوں کو بند کر کے
چل نکلی اور ٹھٹک کر مجھ پہ نگاہ ڈالی

میں اس کو دیکھتا ہوں یہ بات اس نے پالی
آنکھیں اٹھا کے دیکھا اور پھر نظر بچالی
یہ قدرتی صبا ہے دل کی لبھانے والی
دیکھے جو پھر تو شاید تیکھی نظر سے دیکھے
پھیرا ہے رخ تو شاید مڑ کر ادھر سے دیکھے
دیکھا تو اس نے لیکن گردن جھکا کے دیکھا
آنچل کو سر پہ ڈالا اور مسکرا کے دیکھا
کیا ترچھی چتونوں سے آنکھیں چرا کے دیکھا
دیکھا پھر اس نے دیکھو آنچل ہٹا کے دیکھا
پایا نیا جو مجھ کو کچھ شرم آئی اس کو
فطرت کی یہ ادا ہے بننے کا فہم کس کو
چشمے کی راہ لی ہے شاید پیئے کی پانی
پہنچی تو دیکھتی ہے چپ سن کھڑی ردانی
عکس فلک کی رنگت سورج کی ضوفشانی
پانی تو ہے سنہرا اور تہ ہے آسمانی
لہروں میں چلتی پھرتی سورج کی جو چمک ہے
اس سے چمک رہی ہے کیا بجلیوں کو شک ہے

وہ پائنچے سنبھالے پانی تو خیر کم ہے
ٹخنوں ہی تک ہے گہرا اور چند ہی قدم ہے
لیکن لچک بدن میں چلنے سے دمبدم ہے
نازک ہے پاؤں پھسلے پانی میں تو ستم ہے
وہ اوڑھنی نہ سنبھلی پانی سے تر ہوئی ہے
وہ لڑکھڑائی دیکھو دُہری کمر ہوئی ہے
نالا اُتر کے پہنچی زیر شجر کھڑی ہے
ننھے سے دل پہ اس کے ہمت بہت بڑی ہے
کچھ اوڑھنی بدن پر کچھ خاک پر پڑی ہے
خوشے پکے ہوئے ہیں اُن سے نظر لڑی ہے
میں جامنیں گرادوں بہلے یہیں تو اچھا
کھیلے یہیں تو اچھا ٹہلے یہیں تو اچھا

شاعری کی چند ضروری اصطلاحات

شعر - لغوی معنی - جاننا - دریافت کرنا - کسی باریک چیز کی واقفیت + اصطلاحی معنی - وہ سخن موزوں و مقفےٰ جو بالقصد کہا جائے لیکن بعض کی رائے ہے - کہ مقفےٰ ہونے کی شرط نہیں ہے +

قافیہ - لغوی معنے پیچھے چلنے والا - ردیف سے پہلے کا لفظ یا حرف - وہ الفاظ جن کا آخری حرف اور اس کے ماقبل کی حرکت یکساں ہو - اور وہ ردیف سے پہلے آئیں مثلاً قاتل - کامل بسمل +

ردیف - لغوی معنی وہ شخص جو ایک گھوڑے پر کسی سوار کے

پیچھے بیٹھے ۔ اصطلاح میں وہ لفظ جو غزل یا قصیدے وغیرہ کے مصرعوں خواہ بیتوں کے اخیر میں قافیہ کے پیچھے بار بار آئے ۔

مطلع ۔ لغوی معنی طلوع ہونے کی جگہ ۔ اصطلاحی معنی غزل یا قصیدے کے شروع کی بیت جس کے دونوں مصرعوں میں قافیے ہوں ۔

مقطع ۔ لغوی معنی محلِ انتہا و اتمام ۔ اصطلاحی معنی ۔ غزل یا قصیدے کا آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص واقع ہو ۔

رباعی ۔ وہ چار مصرعے جو اوزان مخصوص پر ہوں ۔ چوپائی ۔ چو مصرع ۔ چہار بیلا ۔

غزل ۔ لغوی معنی ۔ معشوق یا اپنے محبوب کے ساتھ کھیلنا ۔ عورتوں کے ساتھ بات چیت ۔ اصطلاح میں وہ نظم جس میں حسن و جمال ۔ فراق و وصال ۔ عشق و فریفتگی ۔ شراب و کباب ۔ فنا و معرفت وغیرہ کا ذکر ۔ یا ہجو و نصیحت وغیرہ ۔ یا وہ نظم جس میں عاشق وصال و فراق کے خیالات کو وسعت دے کر دل کے ارمان یا غم کا بخار نکالے ۔ غزل کے اشعار کم از کم پانچ اور کثرت میں لا انتہا ہو سکتے

ہیں۔ مگر طاق ہونا شرط ہے۔

قطعہ۔ لغوی معنی ٹکڑا۔ پارہ۔ جُز۔ اصطلاحی معنی مطلع کے سوا باقی غزل یا قصیدے کا ایک حصہ۔ جو متفق المضمون ہو اور اس میں کم سے کم دو شعر ہوں + دو بیتوں یا اس سے زیادہ کو جو با مطلع ہوں۔ یا بلا مطلع۔ مگر مضمون میں ایک دوسرے کے متعلق ہوں۔ قطعہ کہتے ہیں۔

مثنوی۔ لغوی معنی۔ دو دو کیا گیا۔ اصطلاح میں ایسے اشعار جن کے ہر بیت کا قافیہ جدا اور دو مصرعوں کا متفق ہو۔ یعنی ہر شعر مطلع کی طرح ہو۔

قصیدہ۔ لغوی معنی ٹھوس اور بھرا ہوا مغز یا دماغ۔ اصطلاح میں قصیدہ اسے کہتے ہیں۔ جو کسی کے لئے بالقصد مدح یا ذم۔ پند۔ یا حکایت کے طور پر نظم کیا جائے۔ اور اس کے پہلے بیت کے دونوں مصرعے دیگر بیتوں کے مصرعہائے ثانی سے ہم قافیہ ہوں۔

تشبیب۔ لغوی معنی جوانی کا ذکر۔ اصطلاح میں قصیدہ کی تمہید کو کہتے ہیں۔ جس میں شباب۔ ساقی یا کسی دوسرے مضمون پر شاعر اپنے جذبات وخیالات ظاہر کرے۔ اور

اس کے آخر میں کسی نہ کسی طرح اس کو مدح کے ساتھ ملا دے ۔

گریز ۔ قصیدے کے اس حصے کو کہتے ہیں ۔ جب شاعر تمہید ختم کر چکنے کے بعد اصل مقصد کی طرف رجوع کرتا ہے ۔

ترجیع بند ۔ لغوی معنی بند کو پھر بیان کرنا ۔ اصطلاح عروض میں جب شاعر چند ایسے بند جو بحر میں موافق اور قافیہ میں مختلف ہوں ۔ بیان کرنا اور ہر ایک بند کے بعد ایک اُسی بند اور مختلف قافیہ کی معین بیت اس طرح بار بار لاتا ہے ۔ کہ یہ بیت ہر بند کی بیت آخر کے مضمون سے مربوط ہو ۔ تو اسے ترجیع بند کہتے ہیں ۔

ترکیب بند ۔ ترجیع بند اور ترکیب بند میں صرف اتنا فرق ہے ۔ کہ اُس میں ایک معین بیت کو ہر بند کے بعد لاتے ہیں ۔ اور اس میں ہر بند کی جداگانہ گرہ ہوتی ہے ۔

مثلث ۔ لغوی معنی تکونا ۔ اصطلاح عروض میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں تین تین مصرعوں کے بند ہوں ۔

مخمس ۔ لغوی معنے پانچ کونے والی شکل ۔ اصطلاحی معنی ایک قسم کی نظم جس میں پانچ پانچ مصرعوں کا ایک ایک بند

ہوتا ہے ٭

مسدس ۔ لغوی معنی شش پہلو ۔ ایک قسم کی نظم جس میں اصل بیت پر چار مصرعے اور بڑھا دیئے جاتے ہیں ۔ یا یوں کہو ۔ کہ وہ نظم جس کے چار مصرعے ہم قافیہ اور اخیر کی بیت بطور گرہ نئے قافیے کے ساتھ ہو ٭

مستزاد ۔ لغوی معنی بڑھایا گیا ۔ عروض میں وہ شعر جس کے ہر مصرعے یا بیت کے بعد ایسا ٹکڑا لگا ہو ۔ جو اسی مصرعے کے رکن اول اور رکن آخر کے برابر ہو ۔ مگر خوبی یہ ہے کہ جس مصرعے یا بیت کے بعد آئے ۔ کلام اور معنی میں ربط بھی رکھے ۔ اور زائد کبھی ایسا ہو ۔ کہ مصرعے یا بیت میں اس کا محتاج نہ ہو ٭

واسوخت ۔ تنفر ۔ بیزاری ۔ وہ اشعار جو بطور مسدس ۔ ترجیع بند یا ترکیب بند معشوق سے جل کر اس کی شکایت ۔ عشق کی برائی ۔ آئندہ کے لئے اپنی بے پروائی اور بیزاری میں لکھے جائیں ٭

شہر آشوب ۔ وہ مدح یا ذم جو شعرا کسی شہر کے متعلق لکھیں کسی شہر کے اجڑنے یا برباد ہونے کا نظمیہ ذکر یا ماتم ٭

ریختی - وہ نظم جو عورتوں کی بولی میں کہی جائے ÷

حمد - وہ نظم جو خدا کی تعریف میں ہو ÷

مناجات - لغوی معنی ہمرگوشی کرنا۔ اصطلاح عروض میں وہ نظم جس میں خدا تعالیٰ کی تعریف اپنی بیکسی اور عاجزی کا بیان نجات طلبی کے ساتھ ہو ÷

نعت - لغوی معنی صفت و ثنا۔ تعریف و توصیف + مدح + مجازاً خاص حضرت محمد مصطفےٰ صلعم کی توصیف ÷

منقبت - صفت و ثنا۔ وہ نظم جو بزرگان دین کی تعریف میں ہو مدح آئمہ کبار۔ واصحاب رسول اللہ صلعم ÷

مرثیہ - مردے کا وہ بیان جس سے رحم اور درد پیدا ہو۔ اوصاف مردہ۔ میت کی صفت۔ وہ نظم یا اشعار جن میں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال اور اس کے رنج و غم کا بیان درج ہو ÷

سلام - لغوی معنی گردن جھکانا۔ تسلیم کرنا + جو مرثیہ رباعی۔ قطعہ۔ غزل یا قصیدے کی طرز پر ہو۔ اور اس کے مطلع یا اول شعر میں لفظ مجرا سلام۔ مجرائی۔ سلامی لایا جائے تو اسے مجرا یا سلام کہتے ہیں ÷

نوحہ ۔ پرسا ماتم ۔ مردے کا بیان کر کے گریہ وزاری کرنا۔

مدح ۔ نظم میں تعریف کرنا۔

ہجو ۔ مذمت برائی کرنا ۔ نظم میں برا کہنا۔

دیوان ۔ مقام دربار ۔ بادشاہوں کی نشست گاہ ۔ اصطلاح میں غزلوں کی کتاب جس میں باعتبار ردیف غزلوں کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہو۔

کلیات ۔ کلی کی جمع ۔ مجموعہ نظم جو ایک ہی شخص کی تصنیف سے ہو۔

مطبوعہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور

